بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پندرہ روزہ تعمیرِ حیات لکھنؤ

ISSN 2582-4619

جلد نمبر ۵۹ | ۲۵ رمئی ۲۰۲۲ء مطابق ۲۳ رشوال المکرم ۱۴۴۳ھ | شمارہ نمبر ۱۴

اس شمارے میں

شعروادب
علم ہے پیدا سوال، عشق ہے پنہاں جواب! — علامہ ڈاکٹر محمد اقبالؒ — ۴

اداریہ
اللہ کا ڈر — شمس الحق ندوی — ۵

نشانِ راہ
آج نبوتِ محمدیؐ پر الحاد و دہریت کا حملہ — حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ — ۶

تعلیم وتربیت
دینی مدارس - اہمیت، افادیت اور ضرورت — حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی — ۱۰

خانۂ کعبہ
دنیا کے بتکدے میں پہلا وہ گھر خدا کا — مولانا عبدالماجد دریابادیؒ — ۱۲

تذکیر واصلاح
مبالغہ آرائی اور رنگ آمیزی — مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی ندوی — ۱۴

عمل صالح
طہارت وتزکیہ — مولانا سید عبداللہ حسنی ندویؒ — ۱۵

تاریخ ہند
اورنگ زیب عالمگیر - تاریخ کا..... — مولانا خالد سیف اللہ رحمانی — ۱۹

علم وعمل
انسانی سماج میں علم کی اہمیت اور..... — مولانا بلال عبدالحی حسنی ندوی — ۲۴

محاسن اسلام
اسلام میں یتیموں کی پرورش اور..... — مولانا محمد طارق نعمان — ۳۰

فقہ وفتاویٰ
سوال وجواب — مفتی محمد ظفر عالم ندوی — ۳۳

سرپرست
حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی
(ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ)

مدیر مسئول: شمس الحق ندوی
نائب مدیر: محمود حسن حسنی ندوی

معاون مدیر
محمد اصطفاء الحسن کاندھلوی ندوی ❁ محمد جاوید اختر ندوی

مجلس مشاورت
مولانا عبدالعزیز بھٹکلی ندوی ❁ مولانا محمد خالد غازی پوری ندوی

قارئین محترم! تعمیرِ حیات کا سالانہ زرتعاون ذیل میں دیے گئے اکاؤنٹ میں جمع کرائیں!

TAMEER E HAYAT
A/c. No. 10863759868 (Current A/c.)
IFSC Code : SBIN0000125 -- Swift Code : SBINNB157
State Bank of India, Main Branch, Lucknow

براہ کرم رقم جمع ہوجانے کے بعد دفتر کے فون نمبر یا ایم میل پر خریداری نمبر کے ساتھ اطلاع ضرور دیدیں۔

ترسیل زر اور خط وکتابت کا پتہ
TAMEER-E-HAYAT
Tagore Marg, Badshah Bagh, Lucknow - 226007, Ph.:0522-2740406
website : http://tameerehayat.com - email : tameer1963@gmail.com

مضمون نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

سالانہ زرتعاون -/400	فی شمارہ -/20	ایشیائی، یورپی، افریقی وامریکی ممالک کے لئے -/75$

ڈرافٹ منیجر تعمیر حیات کے نام سے بنائیں اور دفتر تعمیر حیات ندوۃ العلماء لکھنؤ کے پتہ پر روانہ کریں۔ چیک سے بھیجی جانے والی رقم صرف All CBS Payable Multicity Cheques روانہ فرمائیں، بصورت دیگر =/30₹ جوڑ کر چیک دیں۔ براہ کرم اس کا خیال رکھیں۔

آپ کی خریداری نمبر کے نیچے اگر سرخ لکیر ہے تو سمجھیں کہ آپ کا زرتعاون ختم ہوچکا ہے، لہٰذا جلد ہی زرتعاون ارسال کریں۔
اور منی آرڈر کوپن پر اپنا خریداری نمبر ضرور لکھیں، موبائل یا فون نمبر اور پتے کے ساتھ پن کوڈ بھی لکھیں۔ (منیجر تعمیر حیات)

پرنٹر پبلشر اطہر حسین نے آزاد پرنٹنگ پریس، نظیر آباد، لکھنؤ سے طبع کرا کے دفتر تعمیر حیات مجلس صحافت ونشریات ٹیگور مارگ، بادشاہ باغ لکھنؤ سے شائع کیا۔

شعر وادب

علم ہے پیدا سوال، عشق ہے پنہاں جواب!

علامہ ڈاکٹر محمد اقبالؒ

علم نے مجھ سے کہا عشق ہے دیوانہ پن !
عشق نے مجھ سے کہا علم ہے تخمین وظن!
بندۂ تخمین و ظن! کرم کتابی نہ بن !
عشق سراپا حضور ، علم سراپا حجاب !

عشق کی گرمی سے ہے معرکۂ کائنات!
علم مقام صفات ، عشق تماشائے ذات!
عشق سکون و ثبات ، عشق حیات و ممات!
علم ہے پیدا سوال ، عشق ہے پنہاں جواب !

عشق کے ہیں معجزات سلطنت وفقر و دیں
عشق کے ادنیٰ غلام صاحب تاج و نگیں
عشق مکان و مکیں ، عشق زمان و زمیں
عشق سراپا یقیں ، اور یقیں فتح باب!

شرعِ محبت میں ہے عشرتِ منزل حرام
شورشِ طوفاں حلال ، لذتِ ساحل حرام
عشق پہ بجلی حلال ، عشق پہ حاصل حرام
علم ہے ابن الکتاب ، عشق ہے ام الکتاب !

☆☆☆☆☆

اداریہ

اللہ کا ڈر

شمس الحق ندوی

جو شخص اللہ سے نہیں ڈرتا، جس کا دل اللہ کے ڈر سے خالی ہے، وہ کسی بھی غلط کام کے کرنے میں ذرا بھی نہ ہچکچائے گا، گویا اس کے دل میں دین کا مادہ ہے ہی نہیں، اور جب دین کا خیال واحساس نہ ہو تو اچھے بُرے کا فرق کسی طرح نہیں کرسکتا۔ قرآن مجید نے مخلص مؤمنین کی صفت اس طرح بیان فرمائی ہے: ”اِنَّ الَّذِیۡنَ ھُمۡ مِّنۡ خَشۡیَةِ رَبِّھِمۡ مُّشۡفِقُوۡنَ“ (بے شک وہ لوگ جو اپنے رب کے خوف سے ڈرے ہوئے ہیں)۔ ظاہر ہے ایسے لوگ کوئی بھی غلط کام جو شریعت کے خلاف ہو کرنے کی ہمت نہیں کریں گے۔ اس وقت ہمارے ماحول میں جو خرابیاں پائی جاتی ہیں' ان کا یہی سبب ہے کہ دلوں سے اللہ کا ڈر نکل گیا ہے۔

صحابۂ کرام، صالحین امت اور عاملین قرآن کی یہی خصوصیت تھی کہ ان کے دلوں میں اللہ کا ڈر سمایا ہوا تھا، اس لیے وہ کوئی بھی غلط کام کرنے سے اپنے کو بچاتے تھے، جس کے نتیجہ میں اسلامی معاشرہ، اخوت و بھائی چارہ، عدل وانصاف مل جُل کر رہنے کا بہترین نمونہ تھا، لہٰذا وہ شخص جو اللہ پر، اس کے رسولؐ اور اس کی کتاب قرآن پاک پر ایمان رکھتا ہے' اس کو اپنے دل میں اللہ کا ڈر پیدا کرنا ضروری ہے، اللہ تعالیٰ انسانوں کے ظاہر و باطن، آنکھوں کی خیانت اور دل میں وہ جو خیالات رکھتا ہے' سب کو جانتا ہے، اس سے غفلت کرنا اور اس کا دھیان دل سے نکال دینا اچھے اچھوں کو غلط راستہ پر ڈال دیتا ہے، اسی لیے اسلام کے پہلے رکن نماز کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے؛ نماز بُرے کاموں سے روکتی ہے، فرمایا: ”اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنۡھٰی عَنِ الۡفَحۡشَاۤءِ وَالۡمُنۡكَرِ“ (بے شک نماز روکتی ہے بے حیائی اور بُری بات سے)۔ نماز اسلام کا وہ رکن ہے جو بندۂ مؤمن کی ہر طرح حفاظت کرتی ہے، اور ہر مشکل کو آسان کرتی ہے، اسی لیے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نماز کا سب سے زیادہ اہتمام فرماتے تھے؛ آپؐ نے فرمایا: ''میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے''، اسی لیے علاوہ فرائض کے جب کسی اہم بات کا وقت ہوتا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم فوراً نماز کی طرف توجہ فرماتے تھے؛ جس کی ایک مثال غزوۂ بدر کی نماز ہے، اس وقت آپؐ کی نماز کی جو کیفیت تھی' پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب ''ارکانِ اربعہ'' میں اس کی جو تصویر کشی کی ہے' اسی پر قلم روکتا ہوں، لکھتے ہیں:

''نماز مؤمن کے لیے اس محبت کرنے والی ماں سے بھی زیادہ پناہ لینے، سر چھپانے اور آرام پانے کی جگہ ہے، اور اس کی گود سے بھی زیادہ راحت رساں ہے اور جنت بداماں ہے' جو ایک یتیم، ضعیف وعاجز، بے سہارا اور لاڈلے بچہ کے لیے ہر وقت کھلی رہتی ہے، اور جب بھی بچہ کو کسی قسم کی گزند اور نقصان کا خطرہ ہوتا ہے، کوئی اس کو چھیڑتا ہے اور پریشان کرتا ہے، یا اس کو بھوک پیاس ستاتی ہے، یا وہ کسی چیز سے سہم جاتا ہے تو وہ فوراً ماں سے چمٹ جاتا ہے، اور اس کی گود میں بیٹھ کر سمجھ لیتا ہے کہ وہ سب سے محفوظ ہو گیا، اسی طرح نماز بھی مؤمن کی سب سے بڑی پناہ گاہ اور جائے قرار ہے، یہ وہ مضبوط رسی ہے جو اس کے اور اس کے رب کے درمیان پھیلی ہوئی ہے، وہ جب چاہے اس رسی کو مضبوطی سے تھام کر اپنی حفاظت کی ضمانت حاصل کرسکتا ہے، یہ اس کی روح کی غذا، درد کا درماں، زخم کا مرہم، بیماری سے شفا اور اس سب سے بڑا اثاثہ اور سہارا ہے، ارشاد ربانی ہے: ”یٰۤاَیُّھَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا اسۡتَعِیۡنُوۡا بِالصَّبۡرِ وَالصَّلٰوةِ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِیۡنَ“ (اے ایمان والو! صبر اور نماز سے مدد چاہو! بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے)۔

موجودہ ماحول میں خیر وشر، نیکی وبدی کا امتیاز تک باقی نہیں رہا، باپ بیٹے تک کے تعلقات صحیح نہیں، بھائی بھائی میں اختلاف ولڑائی، شوہر اور بیوی تک کے تعلقات خراب، بے حیائی وفحش کاری کا عام رواج نظر آتا ہے۔ انسان کی ایک بڑی کمزوری یہ ہے کہ وہ اپنے غلط کاموں کی کچھ نہ کچھ تاویل کرکے مطمئن ہو جاتا ہے جو نہایت خطرناک بات ہے، اور اس بات کی علامت ہے کہ اس کے دل میں اللہ کا ڈر نہیں رہا، اور اس کا سب سے بڑا سبب نماز کا اہتمام نہ کرنا اور اس کے تئیں کوتاہی کرنا ہے؛ کیونکہ نماز ہی سے اللہ کی یاد آتی ہے؛ ”وَ اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكۡرِیۡ“ (میری یاد کے لیے نماز قائم کیجیے)، اور اللہ کی یاد اور دھیان سے اللہ کا خوف اور ڈر دل میں پیدا ہوتا ہے، جو مردِ مؤمن کو ہر طرح کی معصیت اور خلافِ سنت وشریعت عمل سے محفوظ رکھتا ہے۔ ☆☆☆

نشان راہ

آج نبوتِ محمدیؐ پر الحاد و دہریت کا حملہ

کوئی شاہین ہے جو اس کے مقابلے کی سعادت حاصل کرے؟

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

طلبہ کی دو قسمیں

میرے عزیزو! بغیر کسی تکلف وتمہید کے میں تمہارے سامنے چند باتیں رکھنا چاہتا ہوں، عزیزوں سے کسی تکلف کی ضرورت نہیں ہوا کرتی، خاندان میں تم نے کبھی نہ دیکھا ہوگا کہ بڑا بھائی چھوٹے بھائی سے تصنع برتتا ہو، یا چھوٹا بھائی بڑے بھائی سے بات کرنے میں تکلف وتمہید اختیار کرتا ہو۔

جو لوگ یہاں آئے ہیں، اور پڑھ رہے ہیں، ان کی دو قسمیں ہوسکتی ہیں: ایک قسم تو ان بھائیوں اور عزیزوں کی ہے جو ماں باپ کے اصرار اور تقاضہ سے یا اس تعلق سے مجبور ہوکر جو اس معاشرہ میں والدین کا اولاد سے ہوا کرتا ہے، یہاں آئے ہیں، یعنی یہ کہ ہمارا ان کا جو تعلق ہے، وہ اس بنا پر ہے کہ وہ ماں باپ کے حکم کی تعمیل میں یہاں آئے ہیں، ان کی یہاں آنے کی نہ تو خواہش تھی اور نہ ان کے نزدیک اس کا کوئی فائدہ تھا، چنانچہ یہاں آنے کے بعد بجائے اس کے کہ یہاں ان کے دل میں اطمینان کی فضا قائم ہوتی، وہ اپنے والدین کے شکر گزار ہوتے، اور ان کی خیر خواہی کے قائل ہوجاتے کہ انھوں نے بہت صحیح جگہ کا انتخاب کیا اور ان کی زندگی کے لیے اچھا راستہ تجویز کیا، ان کے اندر مزید کشمکش پیدا ہوگئی ہے، اب یہ کسی وجہ سے بھی ہو، میں اس کے اسباب نہیں بیان کروں گا، یہاں ان تفصیلات کی ضرورت نہیں، ان کے علاج کی ضرورت ہے۔

ان کو یہاں آکر روز بروز یہ محسوس ہونے لگا کہ ان کو فائدہ یہاں حاصل نہیں ہورہا ہے، ان کے والدین غالباً یہاں کے حالات سے واقف نہ تھے، اور یہاں کی افادیت کا پوری طرح اندازہ انھیں نہیں تھا، وہ یہ سمجھ رہے ہیں کہ جتنا زیادہ یہاں قیام رہے گا اتنا ہی ہمارا وقت گزرتا جائے گا اور کچھ حاصل نہ ہوگا، کوئی خاص چیز یہاں سے ہم لے کر نہیں جائیں گے اور ہمیں برباد کیا جارہا ہے، مجھے اس پر تعجب نہیں کہ عربی مدرسہ میں ایسے لوگوں کی بھی کوئی قسم ہوسکتی ہے، اس لیے کہ واقعات کی دنیا میں بہت سی ایسی باتیں ہوتی ہیں، جن کو ہم پسند نہیں کرتے، یہ بالکل ممکن ہے کہ اچھے اچھے لوگ بھی جو بہت سعید اور صالح ہوں، اور بعد میں جاکر بہت ترقی کریں، علمی ترقی کریں، دینی ترقی کریں، اولیاء اللہ بن جائیں، لیکن یہ ہوسکتا ہے کہ جب تک ان کے دل کو اطمینان حاصل نہیں ہے، وہ کشمکش میں مبتلا رہیں، اور اس قسم کی ذہنی کشمکش میں مبتلا رہیں جو ہر وقت ان کے ساتھ رہتی ہے، اور کسی وقت ان کا پیچھا نہیں چھوڑتی۔

ان سے مجھے یہ کہنا ہے کہ وہ اپنے فیصلہ میں بالکل آزاد ہیں، وہ اگر یہاں آکر بھی مطمئن نہیں ہوئے، اگر وہ یہاں کے نظام کے ساتھ، یہاں کے قواعد، قوانین، ضوابط اور یہاں کی فضا کے ساتھ اشتراک عمل نہیں کرسکتے، اور اس کے ساتھ خوش دلی کے ساتھ نہیں رہ سکتے، انھیں یہاں الجھن ہے، اور دن رات ان کو یہ الجھن ستاتی ہے، اور یہ ان کے لیے ایک مسئلہ بن گیا ہے، تو میں ان سے بہت ہی آزادی کے ساتھ، خلوص اور صاف دلی کے ساتھ کہوں گا کہ وہ طلباء ہمت اور اخلاقی جرأت سے کام لیں، اخلاقی جرأت سے بہت مدد ملتی ہے، اس سے لوگوں نے بڑے بڑے کام کیے ہیں، اس سے بڑے بڑے فیصلے صادر ہوچکے ہیں، وہ اپنے فیصلہ میں آزاد ہیں، وہ اپنے والدین کو صاف صاف لکھ سکتے ہیں کہ یہاں آکر ہمیں اطمینان حاصل نہیں ہوا، ہم یہاں آکر کوئی فائدہ حاصل نہیں کررہے ہیں، اور ہمیں یہ محسوس ہورہا ہے کہ ہمارا وقت ضائع ہورہا ہے، آپ بڑے مغالطہ میں مبتلا ہیں، اور خود کو دھوکے میں رکھے ہوئے ہیں، آپ سمجھ رہے ہیں کہ ہم یہاں بڑی محنت سے پڑھ رہے ہیں، لیکن واقعہ یہ نہیں ہے کہ کس وجہ سے؟ یہ ہم آکر بیان کریں گے، یا پھر کسی موقع سے ذکر کریں گے، بہرحال حقیقت یہی ہے کہ یہاں ہمارا دل نہیں لگ رہا ہے، یہاں ہمیں کوئی فائدہ محسوس نہیں ہورہا ہے، ان بھائیوں سے تو یہ کہنا تھا کہ وہ یہ فیصلہ کرلیں، ہمیں ان شاء اللہ ان سے نہ کوئی شکایت پیدا ہوگی، اور نہ آئندہ ہمارے ان کے تعلق میں ان شاء اللہ کوئی فرق واقع ہوگا، اور نہ ہم ان کے لیے خدانخواستہ کوئی بات زبان سے نکالیں گے۔

دوسری قسم

اب دوسری قسم وہ ہے جو یہاں آنے کے بعد یا یہاں آنے سے پہلے یہاں سے مطمئن ہوگئی ہے، اور جو یہ سمجھتی ہے کہ ہم مدرسہ سے فائدہ اٹھاسکتے ہیں، اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کہ اس نے

ہمیں زریں موقع عطا کیا ہے، علومِ دینیہ میں مہارت پیدا کرنے کے لیے، دین کے مطالب کو اوراس کے مقاصد کو سمجھنے کے لیے، اس کے حقائق ومعارف کو جاننے اوران کے اندر تعمق پیدا کرنے کے لیے اللہ نے بہت اچھا موقع عنایت فرمایا، اس کے تمام سامان یہاں مہیا ہیں، تمام ضروری شرائط جو اس کے لیے ضروری ہیں، یہاں موجود ہیں، جن لوگوں کا کسی درجہ میں اس پر اعتقاد ہے، اور وہ سمجھتے ہیں کہ ہم دارالعلوم کی تعلیم سے فائدہ اٹھاسکتے ہیں، اور علومِ دینیہ میں کمال حاصل کرسکتے ہیں، اور یہاں ہم ان مضامین میں جو پڑھائے جاتے ہیں، اچھی سمجھ اور اعلیٰ دستگاہ پیدا کرسکتے ہیں، اور سب سے پہلے اپنے لیے کہ سب سے پہلے یہی سوال ہے: "قُوْا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا" اور ہر شخص ذمہ دار ہے: "لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى" اس کے بعد اپنے اپنے والدین کے لیے، خاندان کے لیے، پھر اللہ اگر ہمت وتوفیق دے تو اپنے صوبے کے لیے اور توفیق وصلاحیت مزید عطا کرے تو ملک کے لیے اور اگر اللہ تعالیٰ اس سے بڑا حوصلہ اور ظرف عطا فرمائے تو پوری انسانیت کے لیے مفید ہوسکتے ہیں، اور نہ صرف یہ کہ ہم کو اللہ کا راستہ معلوم ہوجائے بلکہ ہم اس راستے کی طرف دوسروں کو بلانے کی بھی صلاحیت اپنے اندر پیدا کرسکتے ہیں، جو یہ سمجھتے ہیں کہ یہ نبوت (صلی اللہ علی صاحبہا وسلم) کی نیابت ہے، جو یہ سمجھتے ہیں کہ یہ وہ دولت ہے جو اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے اس کے مخصوص بندوں کو جن سے وہ امامت اور ہدایت کا کام لیتا ہے، ملتی ہے، ارشاد ہے: "وَجَعَلْنَاهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا وَكَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يُوْقِنُوْنَ" (ہم نے ان کو پیشوا بنایا، امامت کا منصب عطا کیا کہ ہمارے حکم سے وہ دوسروں کو بھی ہدایت کرتے ہیں) جو یہ سمجھتے ہیں کہ یہ صلاحیت وتوفیق جس کسی کو نصیب ہوجاتی ہے، اس سے سو آدمی، ایک ہزار اور ایک لاکھ آدمی اور اللہ تعالیٰ کی فیاضی اور شانِ کریمی سے کچھ بعید نہیں کہ لاکھوں اور کروڑوں آدمی ہدایت پاتے ہیں، اس کے نامۂ اعمال میں لاکھوں اور کروڑوں آدمی لکھے جاتے ہیں، جیسا کہ خواجہ معین الدین اجمیری رحمۃ اللہ علیہ کے حساب میں لکھے گئے، حضرت مجدّد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے حساب میں لکھے گئے، حضرت سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے حساب میں لکھے گئے، امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے حساب میں لکھے گئے، آج ساری دنیائے اسلام میں جتنے مسلمان ہیں، ان میں سے بہت تھوڑی تعداد مستثنیٰ کرکے تمام مسلمان چار مسلکوں میں بٹے ہوئے ہیں: مسلک حنفی، مسلک شافعی، مسلک مالکی اور مسلک حنبلی!

اب آپ یہ دیکھئے کہ ایک ایک کے حساب میں کتنے لوگ آئے، کروڑوں انسان ایک ایک امام کے حساب میں لکھے گئے، اگر ان کے اس زمانے سے جس وقت انھوں نے مسائل کا استنباط کیا، اور لوگوں نے اس سے فائدہ حاصل کرنا شروع کیا، اس وقت تک کا جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے حساب میں کتنے کروڑ بلکہ کتنے ارب انسان لکھے گئے اور یہ بھی تو دیکھو کہ کس خانہ میں لکھے گئے؟ نماز کی فرد میں لکھے گئے، روزہ کی فرد میں لکھے گئے، زکاۃ کی فرد میں لکھے گئے، ارکانِ اربعہ کی فرد میں لکھے گئے، ائمۂ اربعہ کی فہرست میں جو لوگ لکھے گئے، کس کس عنوان کے ماتحت ان کا اندراج ہوا، کتنی نمازیں ان کے حساب میں آئیں، اربوں انسانوں کے اعمالِ خیر ان کے نامۂ اعمال میں لکھے گئے، آج ابھی ظہر کی نماز آپ پڑھیں گے، یقین کیجیے اس بات پر کہ اس کا ثواب امام ابوحنیفہ، امام شافعی کی روح کو پہنچے گا، اس میں ذرا بھی کلام نہیں، قرآن اس پر شاہد! حدیث اس پر شاہد! فقہ اس پر شاہد! اور تمہارے سامنے یہ علماء بیٹھے ہوئے ہیں، ان سے پوچھو کہ کیا اس کا ثواب امام ابوحنیفہ، امام ابو یوسف، امام محمد کو نہیں پہنچا؟ کیا اس کا ثواب امام شافعیؒ، امام مالکؒ، امام احمد بن حنبلؒ کو نہیں پہنچا؟ جن کے مسئلہ کے مطابق تم نے اپنی نمازیں درست طریقہ پر ادا کیں، جن کی محنت واستنباط کے نتیجے میں تم میں سے کسی نے اپنی نماز میں دعائے قنوت پڑھی اور کسی نے چھوڑ دی، ان کو بھی ثواب ملا اور تم کو بھی ثواب ملا۔

کیا کوئی اندازہ بھی کیا جاسکتا ہے، ان کے اجر وثواب کا؟ آج کون ریاضی داں ہے جو ان ائمۂ اربعہ اور ان محدثینِ کرام اور ان فقہائے عظام اور ان مشائخِ کبار کے ثواب کا حساب جوڑ سکے، اور اس کی کوئی میزان متعین کرسکے، کیا کسی میں یہ قابلیت ہے کہ امام شافعی، امام غزالی کے ثواب کا حساب جوڑ سکے؟ امام ابوحنیفہ کے ثواب، سیدنا عبدالقادر جیلانی، مجدد الف ثانی اور شاہ ولی اللہ کے ثواب کی میزان مرتب کرسکے؟ کسی میں ہمت نہیں! یہ وہ جگہ ہے جہاں یورپ کی ساری مشینیں عاجز ہیں، اور ساری دوربینیں عاجز ہیں، اور یورپ کے سارے سائنٹسٹ اور ریاضی داں عاجز ہیں۔

عصر حاضر کے فتنے

خوش قسمتی ہے تمہارا تعلق اسی قسم سے ہے جو

یہ سمجھتی ہے کہ ہم عربی مدرسہ میں کیوں آئے؟ یہاں آنے کا کیا فائدہ ہے، جس کو یہ اطمینان ہے (خواہ کسی بھی درجہ میں سہی) کہ ہم یہاں رہ کر ان اماموں کی صف میں تو نہیں (کہ اس کی کوئی جرأت نہیں کرسکتا) ان کے خادموں اور کفش برداروں کی صف میں شامل ہوسکتے ہیں، لیکن اللہ کے احکام جود وسخا میں کوئی فرق نہیں، اس کا فرمان اور اعلان ہے: كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَهٰٓؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ وَمَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا وہ پھر کوئی نیا امام پیدا کردے تو وہ اس پر قادر ہے، اور اگر پھر کسی کو ہدایت کا وہی ثواب عطا کرنے لگے اور وہی کام لے تو بالکل ممکن ہے۔

آج کتنے بڑے بڑے فتنے ہیں، جو اس وقت جہنم کے شعلوں کی مانند بھڑک رہے ہیں اور پورے پورے اسلامی ملکوں کو جلا کر خاکستر کردینا چاہتے ہیں، اور صحابۂ کرامؓ کے کارناموں پر پانی پھیر دینا چاہتے ہیں۔

آج قسم قسم کے اسلام سوز، ایمان سوز، اخلاق سوز، انسانیت سوز فتنے ابھر رہے ہیں، مادّیت، الحاد، قوم پرستی، نبوتِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم سے آنکھیں ملانے کے لیے تیار ہے، آج مسیلمہ کذّاب نئے نئے روپ میں آرہا ہے، اور نبوتِ محمدی کو چیلنج کررہا ہے۔

آج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سرمایہ پر ڈاکہ ڈالا جارہا ہے، آپ کے قلعہ میں شگاف پیدا کیے جارہے ہیں، آپ کے دارالسلطنت پر حملہ کیا جارہا ہے، اگر آج امام ابوحنیفہ، امام شافعی، امام مالک، امام احمد بن حنبل ہوتے تو میں یقین کرتا ہوں کہ شاید وہ فقہ کی تدوین بھی تھوڑی دیر کے لیے روک دیتے اور اس مسئلہ کی طرف توجہ کرتے، تم خوش قسمت ہو کہ فقہ حنفی، فقہ شافعی کی تدوین کی خدمت تمہارے ذمہ نہیں ہے، اللہ کی حکمتِ بالغہ اور اس کی قدرتِ کاملہ نے اس کے لیے پہلے ہی انتظام کردیا، اور امت کو امام شافعی، امام ابوحنیفہ، امام مالک اور امام احمد جیسے ائمہ عطا کیے، جب کہ ایک لمحہ اور ایک منٹ کی تاخیر کی گنجائش نہیں تھی، تم خوش قسمت ہو، خدا کی رحمت سے مایوس نہ ہو، آج تمہارے لیے کام کے دوسرے میدان ہیں، آج تمہارے لیے الحاد سے پنجہ آزمائی کا موقع ہے۔

تمہارے لیے الحاد اور مادّیت سے آنکھ ملانے کا موقع ہے، یقین مانو کہ اس سے امام ابوحنیفہ، امام شافعی، امام مالک و امام احمد کی روح نہیں، محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی روح خوش ہوگی، آج کب سے یہ صدائیں لگ رہی ہیں کہ:

گوئے توفیق وسعادت درمیاں افگندہ اند
کس بہ میداں درنمی آید سواراں راچہ شد

تمہارا میدان

آج عالم اسلام کی نگاہیں ان درسگاہوں کی طرف لگی ہوئی ہیں، جو ان باتوں کو سمجھنے کی اہلیت وصلاحیت رکھتی ہیں، جن کے بانیوں نے اپنے نصاب ونظام میں اس کی صلاحیت پیدا کرنے کی کوشش کی تھی کہ جب عصر حاضر کا کوئی نیا فتنہ پیدا ہو تو ہمارے فضلاء اس کو سمجھ سکیں اور اس کا مقابلہ کرسکیں۔

نبوت محمدیؐ پر الحاد ودہریت کا حملہ

میرے عزیزو! تمہارے لیے کام کے کتنے وسیع میدان ہیں، اور ان میدانوں میں تھوڑی سی محنت سے آج کیا کچھ مل سکتا ہے، اس لیے جن لوگوں کو یہاں کا قیام عزیز ہو، یہاں کا نظام عزیز ہو، نصاب عزیز ہو، جن کو یہاں کی تعلیم وتربیت اس لیے عزیز ہو کہ نئے خالدؓ اور نئے ابوعبیدہؓ پیدا ہوں، اللہ کی لاکھوں اور کروڑوں رحمتیں ہوں ان کی پاک روحوں پر لیکن ان کی بے چین روحیں زبانِ حال سے کہہ رہی ہیں کہ وہ اب قیامت تک نہیں پیدا ہوسکتے، ہم نے تلوار چلانے اور گردن کٹانے میں ایک لمحہ کا تامل نہیں کیا، ہم نے اپنا کام ختم کرلیا، لیکن آج سر کٹانے اور کاٹنے کی ضرورت نہیں، آج تو باطل سے آنکھیں ملانے کی ضرورت ہے، آج نبوتِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم پر تلواروں کا حملہ نہیں، دلیلوں کا حملہ ہے، مادّیت کا حملہ ہے، قوم پرستی کا حملہ ہے، ہمارے جو عزیز طلبہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہاں رہ کر اس سلسلے میں کچھ کیا جاسکتا ہے، ان کے لیے یہ سعادت مقدر ہے، وہ اس میں حصہ لے کر ان ابرار واخیار، اور ان شہداء واتقیاء کی صف میں جگہ پاسکتے ہیں، جو یہ سمجھتے ہیں کہ یہ دعوت کا ایک ایسا میدان ہے کہ جس کو اللہ تعالیٰ نے محض اپنی اس حکمت کی بنا پر جس کا راز کوئی نہیں جانتا، اس زمانے کے پست ہمتوں کے لیے مقدر کیا ہے کہ اس میں تھوڑی سی محنت سے تم بہت کچھ پاسکتے ہو: من أحیا سُنتی عند فساد أمتی فله أجر مأة شهید کیا تم سمجھتے ہو کہ یہ سنت کون سی ہے، بے شک اگر کوئی ایک سنت زندہ کرے گا تو سو شہیدوں کا اجر پائے گا، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ "سُنّتی" میں سنت کی اضافت جو آپؐ نے اپنی طرف کی ہے، اس کے معنی ہیں میرا چلن، میرا طریقہ، میرا دین اور میرا مسلک، اب ذرا غور کرو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو دین لے کر آئے اس کی دعوت پر جو آج حملے ہورہے ہیں، ان کے مقابلے کے لیے اگر کوئی سربکف ہوکر میدان میں اتر آئے، اور ان حملوں کے لیے سپر

بن جائے تو اس کا مقام کیا ہوگا، یہ مدرسہ جس کو تم حقارت کی نظر سے دیکھتے ہو، یہاں کی ناتمام عمارتیں، یہاں کے متواضع اور خاکسار اساتذہ، یہاں کی بے سروسامانیاں اور یہاں کی بہت سی خامیاں اور یہ کھانے کی خرابیاں "واللہ العظیم" اسی بنا پر ہوسکتا ہے کہ یہاں سے ایسے ایسے لوگ پیدا ہوں جو حق وباطل کے معرکۂ کارزار کے لیے شہسوار ہوں اور جانباز ہوں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جھنڈے کو پھر سے بلند کریں، اور ملحدانہ اور مادّہ پرستانہ تحریکوں اور ایمان سوز فتنوں کا جرأت کے ساتھ مقابلہ کریں، جس کے لیے روحِ نبوی صلی اللہ علیٰ صاحبہا بے چین ومضطرب ہے، اگر ایک ایسی جیتی جاگتی مثال بھی یہاں موجود ہے، اگر ایک دھڑکتا ہوا دل، ایک دیدۂ بینا اور ایک گوشِ شنوا یہاں حاضر ہے، اور ایک متنفس بھی ایسا ہے، جس کو اس بات کا احساس ہے کہ یہاں رہ کر یہ کام ہوسکتا ہے، جو یہ سمجھتا ہے کہ وہ دن ہماری عمر، ہمارے خاندان اور ہماری بستی کی زندگی میں بلکہ ہماری اس پوری آبادی کی زندگی میں بڑا مبارک تھا، جس دن ہمارے والدین نے ہم کو دارالعلوم بھیجا، ان سے ہم کہتے ہیں کہ آج وہ فیصلہ کرکے اٹھیں کہ یہاں وہ اپنے وقت کو صحیح طور سے صَرف کریں گے، یہاں کے درخت سے وہ بہتر سے بہتر پھل توڑیں گے، جس کی توقع کی جاسکتی ہے، وہ یہاں کتاب وسنت کا گہرا اور عمیق علم حاصل کریں گے، اور وہ زندگی گزاریں گے جو ایک داعی اور عالم ربانی کی زندگی سے مطابقت رکھتی ہے۔

یکسوئی کی ضرورت

کتنا بڑا ظلم ہے کہ لوگ ساری دنیا کے راستے بند کرکے اور ساری کشتیاں جلاکر یہاں آکر پڑ گئے ہوں، تم یہاں رہ کر یہ معاملہ کرو کہ تمہارا ایک پاؤں یہاں رہے، اور ایک پاؤں خدا کے دشمنوں کے ساتھ، دشمنانِ اسلام کے قلعہ میں! تمہارا جسم یہاں رہے، اور تمہارا دل باہر! تم یہاں رہو، تمہاری آنکھیں باہر رہیں، اس کی کون اجازت دے سکتا ہے؟ کوئی چھاؤنی اس کی اجازت دے سکتی ہے؟ مدرسہ بھی ایک چھاؤنی ہے، کوئی درسگاہ اس کی اجازت دے سکتی ہے؟ کوئی نظام اس کی اجازت دے سکتا ہے؟ اشتراکی نظام؟ سرمایہ دارانہ نظام؟ کوئی نظام اس کی اجازت نہیں دے سکتا کہ آدمی روس میں رہے، اور امریکہ کا خواب دیکھے یا امریکہ میں رہے اور روس کی طرف دیکھے، تو جب ان آزاد لوگوں میں جن کے لیے دنیا میں کوئی قید وبند نہیں، شراب پیو، جوا کھیلو، بدمعاشیاں کرو، جب ان کے یہاں بھی اس بات کی اجازت نہیں ہے، اور اب تو اس کی بھی اجازت دینے کے لیے لوگ تیار نہیں ہیں کہ ہندوستان میں رہ کر آدمی پاکستان کی طرف دیکھے، تو بتاؤ ہم تمہیں کیسے اجازت دیں کہ تم یہاں رہ کر کالج کی طرف دیکھو، یونیورسٹی کی طرف دیکھو، رہو یہاں اور تیاری کرو وہاں کے لیے، یہ کہاں کی دیانت داری اور کیسی تقسیم ہے؟ کہ ہم تمہارے لیے ایک ایک دانہ مانگ کر لائیں (یہ یقیناً احسان نہیں ہمارا فرض ہے) اور تم اس سے ناجائز فائدہ اٹھاؤ۔

جو لوگ ہدایت ودعوت کا کام کریں گے ان کے متعلق قرآن کا ارشاد ہے: "وَأْمُرْ أَهْلَكَ بِالصَّلَاةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا لَا نَسْأَلُكَ رِزْقًا، نَحْنُ نَرْزُقُكَ وَالْعَاقِبَةُ لِلتَّقْوَىٰ" بھلا بتایئے یہاں کیا موقع تھا: "نَحْنُ نَرْزُقُكَ" کہنے کا؟ بڑے بڑے علماء موجود ہیں، ان سے پوچھو کہ فرمایا تو یہ جارہا ہے کہ اپنے گھر والوں کو نماز کا حکم دو اور اس پر جمے رہو اور پھر "لَا نَسْأَلُكَ رِزْقًا" ہم آپ سے رزق کے طالب نہیں۔

یہ تو ظاہر ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ رزق کے طالب نہیں ہوتے پھر اس کی کیا ضرورت تھی؟ اس کے وسیع معنی ہیں، یعنی ہم اس کے بھی طالب نہیں کہ آپ بھی رزق کے خود کفیل اور ذمہ دار بن جائیں "نَحْنُ نَرْزُقُكَ" ہم اس کے ذمہ دار ہیں، آپ اس کے ذمہ دار نہیں! معلوم ہوا کہ امر بالصّلاۃ اور اس پر محافظت واستقامت سے اللہ کے یہاں رزق کا استحقاق پیدا ہوجاتا ہے، جس کا مطلب یہ نکلا کہ داعی کو اللہ تبارک وتعالیٰ ان شاء اللہ بے یار ومددگار اور فاقہ کش کبھی نہ رکھے گا، بلکہ اس کے طفیل میں ہزاروں آدمی کھائیں گے، ایک شیر شکار کرتا ہے، اس کے طفیل میں سیکڑوں جنگل کے جانور کھاتے ہیں۔

اللہ کی ضمانت ہے، کچھ دن تم محنت کرلو، سعید، ہونہار، محنتی اور جفاکش طالب علم بن جاؤ اور اپنے اندر اخلاص پیدا کرلو اور پھر اللہ کی قدرت ورحمت کا تماشا دیکھو۔

ایک فیصلہ

سمجھنے والوں کے لیے اور جن کے لیے اللہ نے سعادت اور خوش بختی مقدر کی ہے، اتنا ہی بہت کافی ہے، بلکہ کافی سے بھی زیادہ ہے، لیکن آج جو کچھ آپ نے سنا ہے، اس سے فائدہ اٹھایئے اور فیصلہ کیجیے!'' جانے کا فیصلہ ـــ یا ـــ رہنے کا فیصلہ''، جانے کا فیصلہ ہے تو شریفوں کی طرح اور انسانوں کی طرح! اور رہنے کا فیصلہ ہے تو وہ بھی شریفوں کی طرح اور جوانمردوں کی طرح، طالب علموں کی طرح، صاحبِ عزم اور صاحبِ ہمت نوجوانوں کی طرح!!

☆☆☆☆☆

تعلیم وتربیت

دینی مدارس - اہمیت، افادیت اور ضرورت

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی

اسلام مخالف طاقتوں نے اسلام کو کمزور اور بے اثر بنانے کے لیے اسلام کی تقویت کے دو پہلوؤں کو اپنی نقصان رساں کوششوں کا زیادہ نشانہ بنایا ہے، ایک اسلامی شریعت کے وہ ضوابط ہیں جو اسلامی معاشرت کو صالح اور پاکباز رکھنے سے متعلق ہیں، جن میں مرد وعورت دونوں کے معاملات آتے ہیں اور انسانی معاشرت میں درستگی قائم رکھنے کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو ضوابط مقرر کیے گئے ہیں، اور جو اجتماعی معاملات وتعلقات نیز مالی معاملات سے تعلق رکھتے ہیں، اور فقہی قوانین کے تحت آتے ہیں، ان پر اعتراضات کا طریقہ اختیار کیا جاتا ہے۔

دوسرا پہلو کلام الٰہی قرآن مجید سے مسلمانوں کا جو تعلق ہے کہ اس کے ذریعہ مسلمان کے دل کو روحانیت اور اپنے پروردگار کے ساتھ بندگی کے تعلق کو مدد ملتی ہے، بلکہ وہ ایک ایسا منبع ومرکز ہے کہ اس سے مسلمان جتنا بندھا رہتا ہے، اتنا ہی اس میں جذبۂ دینی اور اخلاقی درستگی کی کیفیت پیدا ہوتی ہے، اس پر حملے کیے جارہے ہیں، لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ علوم دینیہ کی خدمت کرنے والے لوگ ان دونوں پہلوؤں کے سلسلہ میں ضروری صلاحیت پیدا کریں، اور اس طرف سے آنے والے خطرات کے مقابلہ کے لیے اپنے طالبان علم کو تیار کریں۔

مغرب کا استعماری ذہن اسلام کو اپنا اصل حریف سمجھتا تھا، اور اب بھی یہی سمجھ رہا ہے، بلکہ مغربی ملکوں کے اصحاب اقتدار نے یہ تک اظہار کردیا ہے کہ کمیونسٹ روس کے بعد ہمارا اصل حریف اسلام ہے، لہٰذا ان کو برابر یہ فکر دامن گیر ہے کہ اسلام کی مذہبی خصوصیت کی حفاظت کے یہ ادارے جو مسلمانوں میں اسلامی خصوصیات کے تحفظ کا کام کررہے ہیں، کسی طرح ختم کردیے جائیں، خواہ طاقت اور سیاسی ڈپلومیسی کے ذریعہ، یا کچھ فرضی الزامات لگا کر ان کی حیثیت کو بے وقعت بلکہ خطرناک قرار دے کر، اس کے لیے مختلف اصطلاحات استعمال کرنے کا طریقہ اختیار کیا گیا، اور تقریباً ہر ملک میں یہ کوشش کی جارہی ہے کہ دینی تحفظ کے یہ ادارے ختم ہوجائیں، اور دنیا میں من مانی زندگی کی فضا عام ہوجائے، اور عملاً دنیا میں یہ دیکھا بھی گیا کہ جن ملکوں میں دینی ادارے ختم کردیے گئے، وہاں اسلامیت بھی ختم ہوگئی۔

ترکستان میں میں نے خود دیکھا کہ جہاں کے سابقہ عہد کے علماء کی تعداد اور کام ایسا زبردست رہ چکا ہے کہ دنیا کے مختلف حصوں میں ان کی تصنیف کردہ کتابیں اس وقت بھی پڑھائی جارہی ہیں، اور ان سے اسلامی تعلیمات اور احکام کے تحفظ کا کام لیا جارہا ہے، روسی عہد میں مسلمانوں کے دینی مدرسوں کے ختم کردینے کے بعد صرف دو نسلیں گزرنے پر یہ حال ہوگیا تھا کہ بہت سے لوگ نماز روزہ تک کا مطلب سمجھنے سے محروم ہوگئے تھے، حتی کہ اسلام میں عبادت کے لفظ کا جو مطلب ہے اس تک سے ناواقف ہوگئے تھے، اسلامی عقیدہ سے اور اس کے احکام سے واقف ہونا تو بہت دور کی بات ہے، وہ معمولی دینی باتوں سے بھی واقفیت نہ رکھ سکے تھے، سوائے ان بعض محدود علاقوں کے جہاں خفیہ دینی تعلیم دی جاتی رہی، ان کے علاوہ بقیہ عام علاقوں میں دین سے بالکل ناواقفیت ہوگئی تھی، اگرچہ وہ اس کے باوجود اپنے کو مسلمان کہتے اور سمجھتے رہے، اسلام سے ان کا رشتہ صرف یہی رہ گیا تھا کہ وہ اپنے کو مسلمان اور مسلمان نسل کا جانتے تھے، ان کے یہاں اسلام کی باتیں بتانے والے نہیں رہے تھے، اب وہاں آزادی ملنے پر فرق شروع ہوا ہے۔

آدمی کی فطرت ہے کہ جو سنتا ہے اور دیکھتا ہے، اسی کو اختیار کرتا ہے، اور جس بات سے ناواقف ہے اس سے وہ محروم رہتا ہے، ضرورت ہے کہ ان مدارس کی اہمیت کو سمجھا جائے اور ان کو بڑھایا جائے اور پھیلایا جائے، کم از کم اس کے ابتدائی مرحلہ کو جتنا عام کیا جاسکے عام کیا جائے، اور جہاں جہاں دین سے ناواقفیت کے حالات ہیں وہاں کی فکر اور زیادہ کی جائے نہ کہ ان کو بے ضرورت بتا کر ان کے معاملہ میں مخالفانہ روش اختیار کی جائے۔ ہماری مذہبی علوم کی یہ درسگاہیں ہماری ملت کے فرزندوں کو اسلام کی ان تعلیمات سے بہرہ ور کرتی ہیں جن سے اس امت مسلمہ کی مسلمہ ہونے کی صفت برقرار رہے، اس لیے کہ اسلامی تعلیمات کے لحاظ سے اس دنیا کے ساتھ توحید ورسالت وآخرت کا عقیدہ قطعی اور لازمی ہے، اس پر یقین اور اس کے مطابق عمل کے بغیر دین اسلام کا بقا نہیں۔

جدید تعلیم کے لادینی سانچے سے گذرے

ہوئے بعض دانشور حضرات ہمارے ان دینی مدارس کو ملت کے لیے غیر ضروری سمجھتے ہیں، ان کے نزدیک دینی تعلیم کی ایسی اہمیت نہیں کہ اس کے لیے علاحدہ سے توجہ کی جائے، کیونکہ دین ان کے نزدیک صرف چند معمولی باتوں تک محدود ہے، اور یہ باتیں بلا خاص نظم وانتظام کے خود بخود معلوم ہوسکتی ہیں، ان کا یہ خیال نہایت سطحی خیال ہے، مسلمانوں کی زندگی میں دین اپنی پوری اہمیت رکھتا ہے، اور زندگی میں پوری وسعت بھی رکھتا ہے، اس بات کو وہ حضرات نہیں سمجھتے جن کے ذہن کی تشکیل خالص مغربی نظام تعلیم میں ہوئی ہے، وہ مغرب کے لادینی نقطۂ نظر سے ہی سوچتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ دین کی تعلیم کے لیے اتنے باقاعدہ انتظام کی کوئی ضرورت نہیں، حالانکہ اگر وہ دین کو زندگی میں وسیع مقام نہ دیتے ہوئے اس کو مسلمان کی زندگی کا صرف ایک پہلو ہی مان لیں تو بھی یہ ماننا پڑے گا کہ جس طرح انسانی زندگی کو میڈیکل کالجوں کی ضرورت ہے تاکہ لوگوں کی زندگی کی صحت کے تحفظ کی اہم ضرورت پوری ہوتی رہے، اور جس طرح انجینئرنگ کالجوں کی ضرورت ہے کہ ان سے زندگی کے ان پہلوؤں کی ضرورت پوری کرنے والے اشخاص پیدا ہوں، اور ان کی ضرورت پوری ہوسکے، اور جس طرح لا کالجوں کی ضرورت ہے کہ حکومت وقت کے قوانین سے واقفیت رکھنے والے ماہرین پیدا ہوں، اور قانونی تحفظ کا انتظام ہو، اسی طرح مذہب کو مسلمانوں کی زندگی کا اگر ایک پہلو ہی تسلیم کرلیا جائے تو بھی ان کو ہمارے ان دینی مدارس کی اہمیت کو ماننا پڑے گا کہ اس ضرورت کے انتظام کے لیے ان کے مدارس کی ضروت ہے، حالانکہ اسلام میں مذہب زندگی کا صرف ایک پہلو ہی نہیں، بلکہ زندگی کے تمام پہلوؤں پر احکام وتعلیمات رکھتا ہے، جن کے جانے اور ان پر عمل کیے بغیر ہم زندگی کو اپنے پروردگار کے حکم کے مطابق نہیں بنا سکتے۔

آج سے ستّر اسّی سال قبل ڈاکٹر محمد اقبالؒ جیسے مغرب ومشرق کے احوال سے واقف اور دونوں کے نظامہائے حیات کی خصوصیات کا تجربہ رکھنے والے شخص نے بھی دینی مدرسوں کی اہمیت بتائی ہے، اور صاف اور مؤثر انداز میں ان کی قدر وقیمت ظاہر کی ہے، وہ کہتے ہیں:

”ان مکتبوں اور مدرسوں کو اسی حالت میں رہنے دو، غریب مسلمانوں کے بچوں کو ان ہی مدرسوں میں پڑھنے دو، کیونکہ اگر یہ ملا اور درویش نہ رہے تو جانتے ہو کیا ہوگا؟ اب جو کچھ ہوگا، میں اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ آیا ہوں۔ اگر ہندوستان کے مسلمان ان مدرسوں کے اثر سے محروم ہوگئے تو بالکل اسی طرح، جس طرح اندلس میں مسلمانوں کی آٹھ سو برس حکومت کے باوجود آج غرناطہ اور قرطبہ کے کھنڈر اور الحمراء اور باب الاخوتین کے نشانات کے سوا اسلام کے پیروؤں اور اسلامی تہذیب کے اثرات کا کوئی نقش نہیں ملتا، ہندوستان میں بھی آگرہ کے تاج محل اور دلّی کے لال قلعہ کے سوا مسلمانوں کی آٹھ سو سالہ حکومت اور ان کی تہذیب کا کوئی نشان نہیں ملے گا“۔

مسلمانوں کے لیے یہ بات قطعی قابل قبول نہیں ہوسکتی کہ ان کی زندگی مذہب سے بے تعلق کردی جائے جس طرح یورپ وامریکہ میں اور ان کے ماننے والوں میں کردیا گیا ہے، اور انسان کو صرف مادی مصلحت کے اندر محدود کردیا جائے، اس کا تجربہ خود مغرب میں اخلاقی وانسانی احساسات و جذبات میں خود غرضانہ اور زندگی کے ہر معاملہ میں خالص مادی نقطۂ نظر کے پھیل جانے میں دیکھا جاسکتا ہے، جس کے خراب نتائج خود وہاں بھی محسوس کیے جانے لگے ہیں، اور ساری دنیا بھی ان کے اثرات کو دیکھ رہی ہے، اور پریشان ہے۔

ہماری مذہبی تعلیم کے یہ ادارے جن کو ممتاز علماء دین اور دین وملت کی صحیح فکر رکھنے والے مسلم دانشوروں نے قائم کیا، اور چلا رہے ہیں، اور ان سے مذہب اسلام کی حفاظت انجام پا رہی ہے، ان کو مسلمانوں کے بدخواہوں کی طرف سے بار بار چیلنج کیا جارہا ہے، اگر ہم اس چیلنج کے خطرہ کو نہیں سمجھ سکیں گے تو ہم بحیثیت مسلمان کے ختم ہوجائیں گے، اور مغربی قوموں کی صفوں میں ایک ذیلی قوم بن کر رہ جائیں گے، اس لیے ضرورت ہے کہ ہماری ان درسگاہوں کو جو مسلمانوں کی زندگیوں میں دین سے واقفیت پیدا کرنے اور اس سے اپنی وابستگی کو قائم رکھنے کے لیے پاور ہاؤس کی حیثیت سے کام کررہی ہیں، اہمیت کی نظر سے دیکھا جائے۔

مسلمانوں کے لیے موجودہ دور مختلف قسم کی اہمیتوں اور تقاضوں کا دور بن گیا ہے، اس وقت عالمی پیمانہ پر اس امت اسلامیہ کو بے اثر بلکہ بے نام ونشان کردینے کی کوشش ہورہی ہے، جگہ جگہ ان کے بقا اور دین کے ساتھ ان کے تعلق کو ختم کردینے کی سازشیں چل رہی ہیں، کہیں علمی وفکری میدان میں، کہیں تمدنی وتاریخی میدان میں، کہیں سیاسی وسماجی میدان میں، ایسے ایسے فتنے کھڑے کیے جارہے ہیں کہ اگر ان کے مقابلہ کے لیے ممتاز اہل علم واعلیٰ صلاحیت کے علماء وفضلاء تیار کرنے کا کام نہ کیا گیا تو اس امت کے وجود کو خطرہ پیش آسکتا ہے۔

☆☆☆☆☆

خانۂ کعبہ

دنیا کے بتکدے میں پہلا وہ گھر خدا کا

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ

سارے روئے زمین پر ذرا سوچئے تو بھلا کوئی ایسا قطعہ بھی ممکن ہے جہاں نماز کے لیے سمت وجہت کی کوئی قید ہی نہ ہو! کیا معنیٰ کہ یوں ہی۔ پورب، پچھم، اتر، دکھن جدھر جی چاہے بس منہ کر کے کھڑے ہوجائیے اور بے کھٹکے رکوع، سجدہ، قعدہ، قیام سب کچھ کرڈالیے اور نماز درست کی درست رہے! تو ایسا کوئی قطعہ ممکن ہے! جی ہاں۔ اور ممکن کیسا، واقع میں ایک قطعہ ایسا ہے۔ اور یاد رکھئے کہ صرف ایک ہی قطعہ ایسا ہے۔ اسی کا نام خانۂ کعبہ ہے۔............ کعبۃ اللہ تو خود ہی قبلۂ عالم وعالمیان ہے۔ تو قبلہ کے اندر قبلہ کیسا! جی۔

در درونِ کعبہ رسم قبلہ نیست

اور وہ جو اقبال نامی شاعر نے کہا ہے:

دنیا کے بتکدے میں پہلا وہ گھر خدا کا

تو اس مصرعہ میں کوئی شاعری نہیں کی ہے۔ ایک سیدھی سادی جانی بوجھی حقیقت کو بس نظر کردیا ہے۔............ عربی تلفظ میں عیدالاضحیٰ کہیے یا عام فہم اردو میں بقرعید۔ بہر حال یہ ہے کہ بالکل قدرتی کہ آج کے دن دل میں بے اختیار اس پیارے گھر کی یاد آئے۔ آج کے دن کہنا چاہیے کہ اسی کی سال گرہ کا جشن ہے اور یہی جشن سارے عالم اسلامی میں چہل پہل پیدا کیے ہوئے ہے۔

مسلمانوں کا خدا، آپ جانئے کہ ہر لطیف سے لطیف تر۔ کوئی مکانی ومقامی خدا تو ہے نہیں۔ مکان ومقام کی ہر قید سے آزاد، سمت وجہت کے ہر شائبہ سے بے نیاز۔

اے دو کمالِ حسن عجب تر زہر عجب!

تو ایسا خدائے بے ہمتا پتھر اور چونے کی کسی عمارے کو "اپنا" گھر کہہ کر پکارے، تو فرمائیے کہ فخر وامتیاز، اور امتیاز کیا معنیٰ۔ صاحب یہ کہیے کہ ناز کا کوئی درجہ اس کے آگے اور اس سے اونچا باقی بھی رہ سکتا ہے؟ یہ "اپنائیت" کی نسبت یقیناً مجازی ہے۔ اور ایک مجاز کیا۔ یوں کہئے کہ مجاز در مجاز کے ستر پردوں میں لپٹی ہوئی۔ پھر بھی ایک نسبت ہے تو! کتنی بڑی اور کیسی پیاری۔ کتنی لطیف اور کیسی عزیز۔ دنیا کی کوئی سی بھی عمارت اس مرتبۂ تخصیص میں نہ اس کی حریف!...... طور تو ایک پہاڑ تھا۔ تاب دم بھر کی برق تجلی کی نہ لاسکا۔ ریزہ ریزہ ہوگیا۔ اور ایک ہمارا کعبۃ اللہ ہے، ہر آن اور ہر لحظہ ایک تازہ تجلی کا حامل، شان جمال وکمال کا مستقل تجلی گاہ اور پھر جوں کا توں قائم ودائم۔ اللہ اللہ۔ بیت اللہ کا ظرف۔

کعبہ لغت میں کہتے ہیں بلند مقام کو۔ تو اب اگر کعبہ کا نام ہی کعبہ پڑا تو یہ طریق تسمیہ کچھ اس طرح کا ہوا کہ جیسے دنیا میں سب سے زیادہ تعریف کیا گیا انسان محمد کہلایا (صلی اللہ علیہ وسلم) اور سب سے زیادہ پڑھے جانے والے نوشتہ کا نام قرآن پڑا۔ یہ کعبہ تو دوسروں کو بلند مقامی عطا کرنے والا۔ اور دنیا جہاں سے کیا مکان اور کیا مکین۔ سب کو سربلندی بخشنے والا ہے۔ حق ہے کہ اسی کو بلند مقامی کی مستقل علامت جانئے۔ بلکہ عین اس کی جان اور روح مانئے۔

قرآن مجید سے اس کے نام بھی کئی ایک بتائے ہیں اور انہیں ناموں کے پردے میں اس کے صفات وکمالات کے جلوے دکھائے ہیں۔

ایک نام ہے ال -بیــــت THE HOUSE یعنی مکان حقیقت میں کہنے کے قابل وہی ایک ہے۔ باقی ہر قصر وایوان اس حقیقت کے سامنے مجاز، اس جسم سے آگے سایہ! کعبۃ اللہ کے لئے یہ ال بیــت ایسا ہی ہے جیسا کتاب اللہ کے لیے ال کتاب! ایک نام اور سنئے ۔ البیت الحرام یعنی مکان مقدس۔ اب سوچئے کہ جو مکان اپنے وقت تعمیر ہی سے مقدس مانا جاتا ہے چلا آرہا ہو، جس کے اعزاز واحترام پر عرب کے بڑے بڑے کٹر مشرک وبت پرست بھی متفق ہوگئے ہوں اور جس کی طرف آج بھی کھونٹ کھونٹ کے مسلمان کیا ہندی اور کیا چینی کیا مصری اور کیا روسی، کیا حبشی اور کیا امریکی، کیا جاوی اور کیا برطانوی سب ہی ہاتھ باندھ کر کھڑے ہوتے ہوں، جھکتے ہوں، گرتے ہوں اور وہ بھی کبھی کبھار نہیں، سال کے ہر دن اور ہر دن میں پانچ بار تو مکان مقدس کا اطلاق اگر اس پر بھی نہ ہوگا تو اور کس پر؟.......... اور ہاں خوب یاد آیا۔ ایک نام تو البیت العتیق بھی تو ہے یعنی مکان قدیم۔ تو اپنے ہاں کی روایتوں میں تو یہ آیا ہے کہ یہ مکان اس زمانہ سے بنا تیار کھڑا ہے جب انسان کو فن تعمیر کی الف بے بھی ابھی پورے طور پر نہیں آئی تھی اور اپنوں کو بھی چھوڑیئے۔ اس معبد اولیں کی قدامت پر تو دوسری قوموں کے مورخ بھی، کیا روسی اور کیا مسیحی صاد کرچکے ہیں۔

اب ذرا چشم تصور کے سامنے ایک مسجد کا نقشہ لے آیئے۔ خوب عریض خوب طویل، جہاں کوئی ساڑھے پانچ سوفٹ کی اور چوڑان بھی کوئی پونے چار سوفٹ کی۔ اس لق ودق مسجد کے صحن کے بیچوں بیچ ایک اونچا کمرہ بنا ہوا ہے۔ چوکور سا اور سیاہ پتھر کا

اور پتھر آس پاس کی خشک پہاڑیوں سے کاٹ کر لائے ہوئے۔ نیچے کرسی سنگ مرمر کی۔ ۱۰ انچ دبیز عمارت مربع نہیں صرف مربع نما، طول عرض سے کچھ نکلتا ہوا۔ لمان کی دیواریں ۴۰ رفٹ اور چوڑان کی ۳۵ رفٹ کی اور عمارت کی اونچائی ۵۰ رفٹ کی۔ چاروں زاویئے چار مختلف ارکان سے موسوم۔ شمالی زاویہ کا نام رکن عراقی جنوبی زاویہ کا رکن یمانی، مغربی کا رکن شامی اور مشرقی کا رکن اسود۔ مشہو و معروف پتھر حجر اسود اسی دیوار میں نصب زمین سے ۵ رفٹ کی بلندی پر۔ طواف کے وقت اسے بوسہ دیجیے اور اپنے دل کا ارمان نکالیے۔ داخلہ کا دروازہ صرف ایک۔ جس پر چھوٹا سا زینہ چاندی کا لگا ہوا۔ ملحقات کعبہ بھی سب کعبہ ہی کے ذیل وضمن میں معزز ومحترم ہیں۔ عظیم، ملتزم، مطاف، مقام ابراہیم۔ چاہ زمزم وغیرہ۔ اور عظمت وتقدس کو ذرا دیر کے لیے الگ رکھئے۔ زیبائی دلکشی کے لحاظ سے بھی سب سے بڑھ چڑھ کر خود یہ سیاہ پوش خانہ کعبہ ہے۔ ہر سال تازہ سیاہ خوشنما غلاف اس کے زیب و زینت میں اضافہ کرنے والا۔ ایک پیکر حسن وجمال ایک مجسمہ خوبی ومحبوبی۔ جب تک چاہیے گردا گرد چکر لگایئے اور جان نچھاور کرتے جایئے۔ پیر تھک جائیں گے دل نہ بھرے گا۔ مکین کی تجلی جمال کی تاب تو کوئی اہل دل ہی لاسکتا ہے۔ مکان کے جمال بے مثال کا مشاہدہ ہم اہل ظاہر بھی کرسکتے ہیں بلا کی دلکشی غضب کی جاذبیت۔! لیلیٰ شب رنگ کی دلکشی اور محبوبی ایک معمّا بنی ہوئی ہے۔ ہمارے شاعروں نے بہت ٹامک ٹوئیں مارے۔ زمین آسمان کے قلابے ملائے۔ یہ سیدھی دوٹوک بات کسی کے منہ سے نہ نکلی وفا کے محبوبوں کی سرتاج ہم رنگ خانہ کعبہ کی تھی۔

☆☆☆☆☆

ہماری مطبوعات

☆ عمدہ کاغذ ☆ بہترین طباعت ☆ خوبصورت سرورق

نمبر شمار	اسمائے کتب	قیمت
۱	قصص النبیین (اول)	45/-
۲	قصص النبیین (دوم)	40/-
۳	قصص النبیین (سوم)	80/-
۴	قصص النبیین (چہارم)	65/-
۵	قصص البنبین (پنجم)	85/-
۶	القراءة الراشدة (اول)	75/-
۷	القراءة الراشدة (دوم)	75/-
۸	القراءة الراشدة (سوم)	90/-
۹	معلم الانشاء (اول)	85/-
۱۰	معلم الانشاء (دوم)	90/-
۱۱	معلم الانشاء (سوم)	80/-
۱۲	مختارات (اول)	130/-
۱۳	مختارات (دوم)	150/-
۱۴	منثورات	155/-
۱۵	الادب العربی	160/-
۱۶	شرح شذور الذھب	120/-
۱۷	الفقه المیسر	165/-
۱۸	قطر الندیٰ	100/-
۱۹	سوانح مولانا محمد یوسفؒ	300/-
۲۰	تہذیب الاخلاق	155/-
۲۱	شذیٰ العرف	170/-
۲۲	تذکرہ مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادیؒ	95/-
۲۳	مباحث فی علوم القرآن	300/-
۲۴	علم التصریف	80/-
۲۵	تمرین النحو	75/-

ملنے کے پتے:

مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، ندوۃ العلماء، لکھنؤ	9889378176
مکتبہ ندویہ، احاطہ دار العلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ	8960997707
مکتبۂ اسلام، امین آباد، گوئن روڈ، لکھنؤ	9415912042
مکتبہ علمیہ، شباب مارکیٹ ندوہ روڈ، لکھنؤ	9198621671
مکتبہ الفرقان، نظیر آباد، لکھنؤ	9936635816

ایک ضروری اعلان: بعض ناشرین کتب نے مجلس صحافت ونشریات کی کتابیں غیر قانونی طور پر طبع کرالی ہیں، اس لیے قارئین سے گذارش ہے کہ مجلس کی جملہ درسی وغیر درسی کتابیں درج بالا مکتبوں ہی سے خریدیں اور بذریعۂ ڈاک بھی طلب کریں، مادر علمی دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے ساتھ آپ کا یہ نہایت مخلصانہ تعاون ہوگا۔

ناشر **مجلس صحافت ونشریات**

ٹیگور مارگ، ندوۃ العلماء، لکھنؤ

تذکیر و اصلاح

مبالغہ آرائی اور رنگ آمیزی

مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی ندوی

بے اصل اور لایعنی باتوں کو اکثر لوگ خرافات سے تعبیر کرتے ہیں، اس لفظ کا قصہ یوں بتایا جاتا ہے کہ عرب میں قبیلۂ جہینہ کے ایک شخص کا نام ''خرافہ'' تھا، جسکو جنوں کی ایک جماعت اچک لے گئی تھی اور وہ ان کے پاس ایک عرصہ تک مقیم رہا، پھر جب اس کو رہائی حاصل ہوئی اور اپنی قوم میں واپس آیا تو وہ بے شمار ایسی ایسی باتیں اور قصے بیان کرنے لگا کہ بالآخر لوگ اس کی صداقت پر شبہ کرنے لگے، اور کچھ ہی دنوں بعد وہ اپنی دروغ بیانی اور مبالغہ آمیزی میں ایسا مشہور ہوا کہ خرافات ہر بے اصل اور لایعنی بات کا نام پڑ گیا، اور اسی وقت سے خرافات کی اصطلاح چل پڑی۔

یہ قصہ تاریخی حیثیت سے چاہے جیسا کچھ بھی ہو، لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ کذب بیانی اور مبالغہ آمیزی میں بڑی لذت ہے، مثلاً ایک باتونی شخص کو آپ لے لیجیے، اس کو جتنی دلچسپی مجلس آرائی اور مبالغہ آمیز گفتگو سے ہوگی اتنی شاید کسی اور چیز سے نہ ہو، چنانچہ وہ اپنی اس ہوس کو پوری کرنے کے لیے بے حقیقت واقعات کو اصل بنا کر پیش کرنے اور اس میں رنگ آمیزی کرنے کے لیے اپنی صلاحیتوں کا استعمال کرتا ہے، وہ لوگوں کو ہنساتا ہے اور ان کو متاثر ہوتے ہوئے دیکھ کر بے حد خوش ہوتا ہے۔

ہمارے معاشرہ میں ایک بڑی تعداد ایسے لوگوں کی موجود ہے جن کا مزاج ہی یہ ہے کہ وہ ہر بات میں رنگ بھر کر اور اس کو مبالغہ کے ساتھ بیان کریں، اس طرح کے لوگ اکثر دوسروں سے سنی ہوئی بات یا کسی واقعہ کو ایسے زاویے سے نقل کرتے ہیں کہ اگر وہ معمولی اور ناقابل اعتنا ہو تب بھی بہت زیادہ ہیبت ناک اور قابل توجہ بن جائے، وہ ایک بات میں کئی بات اور ایک پہلو میں متعدد پہلو ملا کر کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں کہ سامعین پر اثر پڑنا ضروری ہوتا ہے۔

یہ ایک عادت یا معمول ہے جس میں علم و جہل، افراد و جماعت اور چھوٹے بڑے کا کوئی دخل نہیں ہے، بلکہ ایک واقعہ پیش آتا ہے، جو اپنی عمومیت کے لحاظ سے سب پر عیاں ہے، مجالس و محافل میں اس کا چرچا ہے، اخبارات میں اس کی خبریں شائع ہو رہی ہیں لیکن آپ دیکھیں گے کہ جتنی مختلف مجالس ہیں اتنی ہی مختلف باتیں ہو رہی ہیں، وجہ بالکل ظاہر ہے کہ ہر شخص اس خبر یا واقعہ کو زیادہ سے زیادہ اہم بنا کر پیش کرنا چاہتا ہے تاکہ اسی کے مطابق اس کی اہمیت کا اظہار ہو سکے، اور کسی نہ کسی پہلو سے وہ لوگوں کی نگاہوں میں ممتاز نظر آئے۔

کسی بات کو پھیلا کر اس کو اہم بنانے میں لاشعور کا وہ جذبہ کام کرتا ہے جس میں انسان کو اپنی شخصیت کا احساس ہوتا ہے، یہی احساس بعض وقت بہت زیادہ مبالغہ آمیزی پر مجبور کرتا ہے، جہاں سے ایک معمولی حیثیت کا انسان تھوڑی دیر کے لیے بڑی شخصیت کی شکل میں اپنے آئینے میں دکھائی پڑتا ہے۔

مبالغہ آمیزی یا کذب بیانی ایک ہی جنس کی دو چیزیں ہیں، اس جنس میں چونکہ نفس کو بے حد لذت اور خوشی محسوس ہوتی ہے، اس لیے اس کی طرف میلان ہونا ایک فطری بات ہے، نفس کے اس میلان کو اگر کوئی چیز روک سکتی ہے تو وہ صرف دینی بیداری یا خدا کا خوف ہی ہوسکتا ہے، سچ بولنے میں بعض اوقات بظاہر خسارہ اور جھوٹ میں نفع نظر آتا ہے، لیکن اس کے باوجود جھوٹ کا باطنی خسارہ اس قدر بھیانک ہے کہ اس کی مثال معاشرہ میں قدم قدم پر ملتی ہے، چور اپنی چوری میں ماخوذ ہوجاتا ہے تو وہ مختلف طریقوں اور جھوٹ کے ذریعہ اپنی بے گناہی کو ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے، لیکن جوں ہی کوئی فوری اور تکلیف دہ سزا اس کو ملی وہ فوراً اپنی غلطی کا اقرار کرلیتا ہے، حالانکہ اگر وہ صحیح بولتا اور اپنی چوری پر ندامت کا اظہار کرلیتا تو شاید اس کو یہ سزا بھی نہ بھگتنی پڑتی، نفس کے اسی رجحان کو بدلنے کے لیے شریعت نے بار بار معاشرہ کی اس خطرناک بیماری کی طرف توجہ دلائی ہے اور اس سے باز رہنے کی ترغیب دی ہے۔

اس کے برعکس دنیا کے کسی بھی معاشرہ کو آپ لے لیجیے، کہیں بھی جھوٹ، مبالغہ آمیزی اور دروغ بیانی سے روکنے کے لیے کسی قانون یا جھوٹ بولنے پر کسی خاص قانونی سزا کا وجود نہیں ہے، اگر ہم غور کریں تو یہ بات بالکل صاف طور سے نظر آتی ہے کہ جس معاشرہ کے افراد.....

.....بقیہ صفحہ ۱۸ پر

عمل صالح

طہارت وتزکیہ

مولانا سید عبداللہ حسنی ندویؒ

ہر وہ شخص جس کے اندر طبیعت کی سلامتی موجود ہے اور اس کی فطرت بھی صحیح ہے وہ پاکی کو پسند کرتا ہے، ایسے ہی ہر مذہب جو صحیح اصولوں اور انبیاء کے عطا کردہ راستہ پر قائم ہے اس کے یہاں طہارت وپاکی کا اور گندگی سے اپنے آپ کو دور رکھنے کا خاص اہتمام ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ نے پاکی کو انسان کی فطرت میں رکھا ہے، اسی لیے عمومی طور پر اپنے اپنے ذوق کے اعتبار سے لوگ پاکی کا اہتمام کرتے ہیں، مائیں اپنے بچوں کو دھلاتی ہیں یہ بھی پاکی اور صاف کرنے کا ایک نظام ہے اور بستروں کو دھویا جاتا ہے، یہاں تک کہ خود اپنے کو دھویا جاتا ہے یہ سب پاکی کے ہی مناظر ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر اپنے کو ٹھیک رکھنے اور صاف رکھنے کا مادہ رکھا ہے، اور چونکہ اسلام نہایت کامل ومکمل دین ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس کو کامل طور پر باقی رکھا ہے اس لیے اس نے طہارت کا بہت زیادہ اہتمام کیا ہے، اتنا دنیا کے کسی دوسرے مذہب میں نہیں پایا جاتا، لیکن اسلام نے طہارت کی درجہ بندی بھی کی ہے، نمبر ایک پر ابتدائی درجہ کی چیز نظافت ہے اس کا بھی اسلام نے پورا اہتمام کیا ہے، اور نظافت میں وہ ساری چیزیں ہیں جس کو گھروں کی صفائی، آنگن کی صفائی، کمروں کی صفائی سے ہم لوگ تعبیر کرتے ہیں، اسی طرح مسجدیں میلی ہوجاتی ہیں ان کو جھاڑا جاتا ہے، ان پر رنگ کرایا جاتا ہے، یہ سب چیزیں نظافت سے تعلق رکھتی ہیں اور اسی طرح جسم انسانی میں بھی نظافت کا اہتمام کروایا گیا ہے جس کو فطرت سے تعبیر کیا گیا ہے کہ ناخون کاٹے جائیں، داڑھی، مونچھیں، بال اور آنکھوں کو بھی صحیح رکھا جائے، اور تیل کا بھی استعمال کیا جائے، اس کے علاوہ جسم کو دھویا جائے وغیرہ وغیرہ، یہ ساری چیزیں ابتدائی درجہ میں شامل ہیں، جن کو ہر آدمی اپنے اپنے انداز سے کرتا ہے، اور جو شخص ایسا نہیں کرتا ہے، اس کو اس کے گھر والے برا سمجھتے ہیں، اسی لیے اس کو فطرت میں بھی شامل کیا گیا ہے۔

طہارت کا مقصد

اسلام کے اندر اس کے بعد دوسرا درجہ طہارت کا ہے، اور طہارت کے لیے اسلام کا کہنا ہے کہ اعضاء اور جسم کو خاص انداز سے دھویا جائے اور اس دھونے کو گویا کہ اسلام کی ایک علامت بھی بنادیا گیا ہے، یعنی وضو کرنے کا حکم دیا گیا ہے، جس کو کرنا مسلمان ہونے کی علامت ہے، اور اس کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ آدمی اپنے تصور وتخیل میں اچھی طرح پاک صاف ہوجائے، اور اللہ کے نزدیک بھی پاک ہوجائے، کیونکہ تخیل کے تصور کا انسان کے اوپر غیر معمولی اثر پڑتا ہے، اور اسی لیے اس میں نیت کا بھی حکم دیا گیا ہے کہ وضو اور غسل نیت کرکے کرنا چاہیے، اس لیے کہ جب نیت کے ساتھ کیا جائے گا تو اس کا بھرپور فائدہ حاصل ہوگا، اسی لیے حدیث میں آتا ہے کہ انسان جب اعضاء دھوتا ہے تو اس کے گناہ پانی کے ساتھ گرتے ہیں، اور یوں بھی جب انسان نیت کے ساتھ وضو کرتا ہے تو اس کا پہلا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ اس کی مکمل اوپری صفائی بھی ہوجاتی ہے، دوسرے اس کے ہاتھ سے جو گناہ ہوئے ہوتے ہیں وہ بھی جھڑ جاتے ہیں، معلوم ہوا گویا کہ اسلام نے دو تصور دیے ہیں، ایک ظاہری صفائی اور ایک باطنی صفائی، ظاہری صفائی تو ہاتھ کا دھولینا ہے اور باطنی صفائی وہ ہے کہ جب آدمی گناہ کرتا ہے تو سر کے اندر خرابی آجاتی ہے لہٰذا جب چہرہ دھلتا ہے تو انسان کے سر کے گناہ جھڑ جاتے ہیں۔

نظافت

اسی طرح پورے جسم کا معاملہ ہے کیونکہ آدمی نہ جانے کیسے کیسے گناہوں میں مبتلا رہتا ہے جن کی وجہ سے گندگی پیدا ہوجاتی ہے اور گناہ گندگی کا نام ہے، جس کی بہت سی قسمیں ہیں جیسے کہ غسل کی حاجت بڑا حدث لاحق ہونے پر پڑتی ہے جس کی وجہ سے آدمی کو نہانا پڑ جاتا ہے اور اگر کوئی صرف استنجاء وغیرہ کرے یا صرف ریاح کا خروج ہوجائے تو وضو کافی ہوتا ہے، ایسے ہی بعض دفعہ ایسا گناہ ہوجاتا ہے جس سے ایمان ٹوٹ جاتا ہے جیسے یہاں وضو اور غسل ٹوٹ جاتا ہے ایسے ہی بعض گناہوں سے ایمان ٹوٹ جاتا ہے، مثلاً: کفر اور شرک سے ایمان ٹوٹ جاتا ہے اور بدعات وخرافات سے ایمان ہل جاتا ہے اور دوسرے جو گناہ ہیں ان سے بھی ایمان میں کمزوری آجاتی ہے، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے انسان کو پاک صاف رکھنے کے لیے ترتیب رکھی ہے، جس کا پہلا درجہ نظافت ہے لہٰذا ہر شخص کو انسانی اعتبار سے پاک صاف رہنا چاہیے اور اگر کوئی شخص صاحب ایمان ہے تو اگر وہ اس نظافت میں نیک نیت بھی کرلے تو اس کا مقام اور بلند

ہوجائے گا،اور اس کے بعد دوسرا درجہ طہارت کے اختیار کرنے کا ہے، یعنی اگر کوئی انسان استنجاء سے آیا ہے یا ریاح خارج ہوئی ہے تو اس کو وضو کرلینا چاہیے تا کہ استنجاء اور ریاح سے اتنی دیر غفلت میں رہنے کی وجہ سے جو ایک کدورت پیدا ہوجاتی ہے ، وہ کدورت وضو کے ذریعہ دھل جائے اور آدمی اس سے پاک ہوجائے، اسی لیے طہارت میں انسان کی جس قدر نیت صادقہ ہوتی ہے اسی قدر اس کا مرتبہ بلند ہوتا چلا جاتا ہے، جیسا کہ حدیث میں آتا ہے کہ سخت سردی کے زمانہ میں مشکل کے باوجود مکمل طور پر وضو کرنے سے انسان کے سارے گناہوں کو معاف کردیا جاتا ہے اور اس کے درجات کو بلند کردیا جاتا ہے۔

تزکیہ

طہارت کے بعد تیسرا درجہ تزکیہ کا ہے، جس کا تعلق دل ودماغ سے ہے، اور اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنے دماغ کو برے جذبات سے پاک کرلے اور دل کی جو بیماریاں ہیں ان کو دل سے نکال دے، تو دل کا تزکیہ ہوجائے گا اور دماغ کا تصفیہ ہوجائے گا اور وہ حقیقی مومن ہوجائے گا، کیونکہ مومن اسی کو کہتے ہیں جو پاک صاف ہو اس کے اندر شرک کا، کفر کا، گندگی کا کوئی شائبہ بھی دل ودماغ کے اندر موجود نہ ہو، اور نہ ہی جسم پر ظاہری اعتبار سے موجود ہو، معلوم ہوا جس کا ایمان اس درجہ کا ہو وہ مومن ہے اور ایمان سب سے اعلیٰ درجہ کی چیز ہے اس سے بڑی کوئی چیز نہیں ہے، لیکن یادرہے کہ ایمان کا تعلق دل سے ہے۔

ایمان کی مثال

ایمان کے دل سے تعلق کو بطور مثال یوں سمجھا جاسکتا ہے کہ ایمان گویا گورنر کی طرح ہے، حالانکہ ایمان تو بلند حیثیت کا حامل ہے، جس کے سامنے صدر مملکت بھی کچھ نہیں ہے، لیکن سمجھانے کے لیے یہ مثال بیان کی جاتی ہے: جیسے کسی ملک کا صدر ہو اور وہ کسی شہر میں جلسہ کے اندر شریک ہونے کے لیے آرہا ہو، تو وہ جہاں بیٹھے گا اس جگہ کی اچھی طرح صفائی کی جائے گی، اسٹیج کو خوشنما بنایا جائے گا، گلیوں کو مہکایا جائے گا، اور جس کرسی پر بٹھایا جائے گا اس کو اچھی طرح سجایا جائے گا، تا کہ گورنر صاحب ناراض نہ ہوجائیں اس لیے ان کے شایان شان استقبال کیا جائے گا، لہٰذا ایسے میں جو سڑکوں وغیرہ کو صاف کیا گیا ہے یہ گویا کہ نظافت کا مرحلہ تھا، اور اس کے بعد اس کو چھڑکاؤ کیا جانا اور چونا ڈالنا اور گندگی وغیرہ کی صفائی کے لیے مزدور کو لگانا، یہ طہارت کا مرحلہ ہے، اور اس کے بعد جہاں پر وہ آکر بیٹھے گا وہاں چاندنی وغیرہ کا بچھایا جانا اور پھولوں کا ڈالنا اور اعلیٰ درجہ کی کرسی کا رکھا جانا، اس کے تزکیہ کا مرحلہ ہے، لیکن یہاں پر ہم لوگوں نے ایمان کو اتنا گھٹیا سمجھ لیا کہ اس کو ہر کس وناکس جگہ پر گھسیٹتے پھرتے ہیں، ورنہ ایمان تو اس سے کہیں درجہ بڑھ کر ہے، اسی لیے ایمان کو ان تینوں مراحل کی ضرورت پیش آتی ہے کیونکہ اس کی حیثیت گورنر سے کہیں بلند ہے، لہٰذا جب یہ تینوں چیزیں ہوں گی، تو حقیقی معنی میں انسان کے دل میں ایمان اسی وقت آئے گا، ورنہ جس طرح انتظامیہ کی کچھ کمی ہونے پر گورنر صاحب نہیں آسکتے، اسی طرح ان تینوں مرحلوں میں سے کسی ایک کے اندر کمی ہونے سے ایمان بھی دل میں نہیں آئے گا۔

مومن کا مصداق

حدیث میں آتا ہے کہ جب آدمی زنا کرتا ہے تو اس وقت وہ مومن نہیں ہوتا، اس کا مطلب یہی ہے کہ جس وقت انسان گندا ہے تو اس وقت ایمان موجود نہیں ہوتا بلکہ ہٹ جاتا ہے، جس کو یوں سمجھا جاسکتا ہے کہ جس طرح کوئی شخص بلا کسی وجہ کے صدر صاحب کی موجودگی میں احتجاج کرے اور کالا جھنڈا دکھائے تو وہ چلا جائے گا، اسی طرح اللہ نے ایمان کی جو دولت عطا کی ہے اس کے مقابلہ میں کوئی شخص شرک وکفر اور بدعات وخرافات کی باتیں کرے، تو پھر اس کا ایمان بھی رخصت ہوجائے گا، لیکن اس کے بعد اگر کوئی ایسا شخص ایمان کی طرف دوبارہ پلٹ کر آجائے تو اس کے متعلق دوبارہ اعلان خداوندی کردیا جاتا ہے کہ اس کو یہ نعمت دے دی جائے، غرض کہ اس کے بعد اس شخص کا جس درجہ کا ایمان ہوگا اسی درجہ اس کو ایمان کی حلاوت بھی نصیب ہوگی، اور اس کے بعد ایسے شخص کو اللہ تعالیٰ پاکیزہ زندگی عطا فرمادے گا، جس کو قرآن مجید میں "حیاۃ طیبۃ" سے تعبیر کیا گیا ہے: "مَنۡ عَمِلَ صَالِحاً مِّن ذَكَرٍ أَوۡ أُنثَى وَهُوَ مُؤۡمِنٌ فَلَنُحۡيِيَنَّهُ حَيَاةً طَيِّبَةً" [النحل:۹۷] (ایمان کی حالت میں جو بھی بھلا کام کرے گا وہ مرد ہو یا عورت ہم اس کو ضرور پاکیزہ زندگی بخشیں گے)۔

یعنی ایسے شخص کو ہم پاکیزہ اور خوشگوار زندگی عطا فرمائیں گے، طیب کے معنی پاک صاف کے ہیں، قرآن شریف میں طیب کا لفظ تیمّم کی مٹی کے لیے استعمال کیا گیا ہے، فرمایا گیا ہے: "فَتَيَمَّمُواۡ صَعِيداً طَيِّباً" (پاک مٹی سے تیمّم کرو)۔

معلوم ہوا کہ جب مٹی طیب ہو تو وہ تیمّم کے لائق ہوتی ہے، اسی طرح جب صاحب ایمان پاک ہوجاتا ہے تو وہ بھی مصافحہ کے لائق ہوجاتا ہے اسی لیے اس کو "حیـاۃ طیبۃ" سے تعبیر کیا گیا ہے، اور انسان کے طیب ہونے کا یہ فائدہ ہوتا ہے کہ جس طرح طیب مٹی کو چھونے سے انسان پاک ہوجاتا ہے اسی طرح طیب آدمی کے ملنے سے

انسان کے گناہ جھڑ جاتے ہیں، جس کی وضاحت حدیث شریف میں ہے کہ جب دو مومن آپس میں ملتے ہیں تو ان کے گناہوں کو ان کے جدا ہونے سے پہلے ہی معاف کر دیا جاتا ہے۔

دخول ایمان کی شرط

لیکن آج کل کا مرض یہ ہے کہ انسان تزکیہ کے مرحلہ سے بالکل عاری ہے، اور تزکیہ نفس سے بہت دور جا چکا ہے کیونکہ ہر انسان کے دل میں حسد، کینہ، تکبر، گھمنڈ، ایک دوسرے کے خلاف جلن انتہائی درجہ میں موجود ہے اور ہر انسان نہ جانے کیسی کیسی خرافات میں مبتلا ہے، یوں کہہ لیجیے کہ آج انسان کے ذہن و دماغ میں جھاڑ جھنکاڑ موجود ہے اور گویا کہ چڑیوں نے اپنے گھونسلے بنا رکھے ہیں جس کے نتیجہ میں ایک گندگی پیدا ہو گئی ہے جو ذہن و دماغ میں اٹی ہوئی ہے، لہٰذا یاد رکھیں کہ ایسے حالات میں دلوں کے اندر ایمان آنے والا نہیں ہے، کیونکہ ایمان جبھی آتا ہے جب دل کو پاک صاف کر لیا جائے، اسی لیے اسلام میں نظافت و طہارت اور تزکیہ کا بڑا درجہ رکھا گیا ہے، تاکہ ان تینوں خوبیوں کو لوگ اپنے اندر پیدا کریں اور پھر ایمان اپنی برکات کے ساتھ دلوں کے اندر آ سکے، اور یہ حقیقت ہے کہ اسلام اور ایمان جب کسی کے دل میں آتا ہے تو سکون و چین لے کر آتا ہے، اور سکون و چین اسی وقت ممکن ہے جب ان تمام چیزوں کا اہتمام کیا جائے۔

نظافت کا فقدان

آج افسوس اس بات کا ہے کہ ہمارے یہاں پہلا مرحلہ ہی مفقود ہو چکا ہے یعنی نظافت کا بھی کوئی خاص اہتمام باقی نہیں رہ گیا، اگر آج دیکھا جائے کہ مسواک کرنے والے، اور دانتوں کی صفائی کا اہتمام کرنے والے کتنے ہیں؟ منہ کی بدبو سے بچنے والے کتنے ہیں؟ اپنے گھروں کو صاف رکھنے والے کتنے ہیں؟ اور اپنے گھروں کو منظم رکھنے والے کتنے ہیں؟ جو کہ نظافت ہی کا ایک جز ہے، تو خال خال کوئی نظر آئے گا، حالانکہ اسلام میں انتظام کا بہت خیال رکھا گیا ہے، مثلاً: نماز کے اوقات مقرر کر دیے گئے، روزہ کا وقت مقرر کر دیا گیا، سحری و افطار کا وقت مقرر کر دیا گیا، غرض کہ یہ ساری باتیں انتظامی چیزوں سے تعلق رکھتی ہیں، ورنہ اگر ان کو متعین نہیں کیا جاتا تو ہر شخص اپنے اپنے اعتبار سے ان ارکان کو انجام دیتا، لیکن متعین کرنے سے اسلام نے اپنے نظام کو گویا کہ مضبوط کر دیا، الغرض مندرجہ بالا باتوں سے یہ بخوبی معلوم ہوتا کہ مسلمان آج نظافت میں انتہائی پیچھے جا چکے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو پاکی اور صفائی کا خاص حکم دیا ہے، اس لیے کہ ایمان اسی وقت ملے گا جب آدمی پاکی کے اس مقام پر پہنچے گا، جس کو سابقہ سطور میں ذکر کیا گیا ہے، غرض کہ اگر ہم جسمانی و مکانی اعتبار سے پاک صاف رہنے کے عادی ہو جائیں تو صحیح معنی میں مومن کہلانے کے مستحق ہو سکیں گے، لیکن ایسا نہ ہو کہ ہم گندگی کے خوگر ہو جائیں جیسے آج یہ امت جس کو خدا اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے پاک بنایا تھا انتہائی گندی ہوتی جا رہی ہے، آج اگر مسلمانوں کے محلوں کی گندگی کا عالم دیکھا جائے تو ایسا لگتا ہے کہ ان کو ذرا بھی نظافت سے کوئی تعلق نہیں ہے، حالانکہ حکم خداوندی یہ ہے کہ اپنے آنگن کو بھی صاف رکھو، لیکن صورت حال یہاں تک خراب ہو چکی ہے کہ آج لوگ مسلمانی نام رکھ کر بھی بآسانی یہ کہہ دیتے ہیں: ''ہم ناپاک ہیں، اس لیے نماز نہیں پڑھ سکتے'' جب کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مسلمان کے تعلق سے فرمایا تھا: مومن کبھی ناپاک نہیں ہوتا، آج انہیں احادیث پر عمل ترک کرنے کی وجہ ہے کہ جنہوں نے ان احادیث و احکام کی تعمیل کی تھی انہوں نے قرن اول میں اور بعد کے ادوار میں بھی اسلام کا اچھا نمونہ پیش کیا تھا، لیکن جب ہم نے ان چیزوں کو ترک کر دیا تو آج ہماری وجہ سے اسلام کی شکل لوگوں کے سامنے دوسرے پیرایہ میں ڈھل چکی ہے۔

اسی طرح طہارت کا معاملہ ہے کہ اگر دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ وضو میں بجائے تین دفعہ دھونے کے آج کل لوگ سات آٹھ مرتبہ تک دھوتے چلے جا رہے ہیں، حالانکہ اس سے آگے بڑھنے کی اجازت ہی نہیں ہے، اسی طرح نہ ہی وضو میں نیت کرتے ہیں، اور نہ ہی تین دفعہ دھونے پر اکتفا کرتے ہیں، جو کہ سراسر غلط ہے۔

نماز کی روح

انسان کے ایمان کو اعلیٰ درجہ کا ہونے کے لیے بہترین ذریعہ نماز ہے اسی لیے نماز سے پہلے طہارت کا خاص حکم بھی دیا گیا ہے، جس کے نتیجہ میں انسان کو صحابہ والی نماز میسر ہوتی ہے، اور سب سے اہم چیز جس سے انسان سب سے اعلیٰ مقام پاتا ہے وہ نماز ہے، اس لیے نماز کے لیے طہارت کا خاص اہتمام کرنے کو حکم دیا گیا، کیونکہ نماز کا دار و مدار طہارت پر موقوف ہے، اسی لیے جب حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ نے حضرت سید احمد شہیدؒ سے درخواست کی تھی کہ صحابہ والی نماز پڑھنا چاہتا ہوں، تو سید صاحب نے فرمایا: پہلے آپ صحابہ والا وضو کیجیے، اس کے بعد نماز میں بھی وہی کیفیت حاصل ہو جائے گی، چنانچہ جب انہوں نے اسی کیفیت کے ساتھ وضو کیا تو خود فرماتے ہیں کہ حقیقی ایمان کی لذت محسوس ہو رہی تھی، لہٰذا

اسی سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اگر ہماری طہارت کمزور ہے تو نماز بھی کمزور ہوگی، اور یہی وجہ ہے کہ طہارت پہلے رکھی گئی ہے، تاکہ نماز اچھی ہوجائے، کیونکہ روحانیت کے میدان میں آگے بڑھنے کے لیے نماز کا مرتبہ بہت بلند ہے، اس لیے کہ اس کو مومنین کی معراج سے بھی تعبیر کیا گیا ہے، لیکن اگر ہم سفر سے پہلے گاڑی میں تیل ہی نہ ڈالیں تو جس طرح گاڑی آگے نہیں چل سکتی، اسی طرح اگر ہم نماز سے پہلے اپنے ذہن ودماغ کو معطر اور پاک کرکے اللہ کے دربار میں حاضر نہ ہوں تو نماز کا مزا کیسے حاصل ہوسکتا ہے؟

اکل حلال

اسی طرح انسان کو اس طہارت کے ساتھ ایک دوسری طہارت کا بھی خاص خیال رکھنا ضروری ہے جس کے بغیر عبادات میں مزا نہیں آسکتا، وہ ہے ''اکل حلال کی طہارت''، یعنی انسان جو لقمہ کھارہا ہے وہ بھی حلال ہونا چاہیے، تب نماز میں مزا آئے گا، لیکن اگر وضو بھی صحیح نہ ہو اور لقمہ بھی حلال نہ ہو تو عبادات میں مزا آنا ناممکن ہے، غرض کہ معلوم یہ ہوا طہارت بڑی اہم چیز ہے، حالانکہ عموماً اس کو لوگ نظر انداز کردیتے ہیں، محض باتیں کرتے ہوئے ہی وضو کرلیا جاتا ہے کوئی خاص اہتمام اور نیت کا استحضار نہیں ہوتا، حالانکہ ایک پٹرول ڈلوانے والا بھی چیک کرتا رہتا ہے کہ صحیح بھر رہا ہے یا نہیں؟ وہاں کوئی باتیں نہیں کرتا ہے، لیکن جب وضو کیا جاتا ہے تو گویا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ساری باتیں وضو خانے ہی میں ہوجائیں گی، حالانکہ وضو کرتے وقت سب سے پہلے استحضار نیت کے ساتھ بسم اللہ پڑھنا چاہیے، اور بعد کی دعاؤں کا اہتمام کرنا چاہیے، اور اعضاء کو صحیح طور پر دھونا چاہیے، کیونکہ اعضاء کے سوکھے رہ جانے پر اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے سخت وعید بیان فرمائی ہے کہ وضو میں جو ایڑھیاں سوکھی رہ جاتی ہیں ان کے لیے جہنم کی ہلاکت طے ہے۔

اسی لیے ہر مسلمان پر ضروری ہے کہ وہ اچھی سے اچھی طرح وضو کرنے کی کوشش کرے، لیکن اس کو بھی سمجھنے کے لیے اگر کسی بزرگ کی صحبت میسر ہو تو انسان کو ان کی خدمت میں رہ کر یہ چیزیں ضرور سیکھنا چاہئیں کہ کس طرح سے وضو کیا جاتا ہے، کیونکہ انسان بسا اوقات اپنے علم کے مطابق صحیح کام کرتا ہے لیکن اگر بزرگوں کی صحبت میں رہ کر اپنے ان اعمال کا موازنہ کرتا ہے تو بالکل ہیچ نظر آتے ہیں۔ حضرت مولانا علی میاںؒ ندوی پر جب فالج کا اثر ہوا، تو آپ کو وضو کرانا پڑتا تھا، لہٰذا ایک مرتبہ میں نے بھی یہ سعادت حاصل کی، جس سے اچھی طرح یہ بھی معلوم ہوگیا کہ وضو کس طرح کرنا چاہیے۔

☆☆☆☆☆

.....بقیہ صفحہ ۱۴ کا

آپس میں کذب بیانی روا رکھتے ہوں وہ ہرگز کامیاب اور مؤثر سوسائٹی قائم کرنے کی اہلیت نہیں رکھتے، اور نہ وہ دنیا میں کوئی ذہنی یا فکری انقلاب برپا کرنے کی استطاعت رکھتے ہیں۔

اسلامی معاشرہ اپنے پہلے دور میں جن خصوصیات کا حامل تھا، ان میں حق گوئی اور بے باکی کو بڑی اہمیت حاصل ہے، تاریخ میں اس کی مثالیں کثرت سے موجود ہیں، بڑے بڑے بادشاہوں کے سامنے حق گوئی وراست بازی کا وہ معیار اس معاشرہ کے افراد نے قائم کیا جس کی مثال اب مفقود ہے، یہی وجہ تھی کہ وہ سوسائٹی نہایت پاک وصاف اور اخلاقی اقدار کا ایک اعلیٰ نمونہ تھی، وہاں کذب وافترا، اور ریاکاری ومصلحت بینی کا کہیں وجود نہ تھا۔

لیکن زمانہ جوں جوں گذرتا گیا، اخلاقی انحطاط بھی رونما ہوتا گیا اور اب اسلامی معاشرہ میں وہ ساری خرابیاں اور وہ تمام خطرناک بیماریاں داخل ہوچکی ہیں جو نہ صرف چند افراد یا کسی جماعت کے لیے خسارہ وہلاکت کا باعث ہیں، بلکہ پوری سوسائٹی اس خطرہ سے دوچار ہے، قدم قدم پر ایسی مثالیں ملتی ہیں جن میں سراسر اخلاقی انحطاط اور ذہنی گراوٹ کی کارفرمائی ہوتی ہے۔

معاشرہ کا ایک شخص کبھی اپنے دوسرے ساتھی کے لیے کسی عزت، بڑائی اور بلندی کو نہ صرف یہ کہ گوارا نہیں کرسکتا، بلکہ اس کی پوری کوشش یہ ہوتی ہے کہ عزت وبڑائی اس شخص سے منتقل ہوکر اس کی طرف آجائے، اگر صرف اتنا ہی ہوتا کہ کسی کی عزت وبلندی کو دیکھ کر یہ تمنا ابھرتی کہ وہ اس کے اندر باقی رہتے ہوئے اپنے اندر بھی پیدا ہوجائے تو زیادہ نقصان دہ نہ تھا، لیکن نفس کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ:

☆ دوسرے کو نقصان پہنچا کر خود فائدہ حاصل کرنا۔

☆ دوسرے کو ذلیل کرکے خود عزت ووقار پانا۔

☆ دوسرے کو محتاج بنا کر خود صاحب دولت ہونا۔

میں سمجھتا ہوں کہ ان خرابیوں کی ایک ہی وجہ ہے، اور وہ یہ ہے کہ کذب کے ساتھ حسد بھی پوری طرح اپنا کام کرتا ہے، ذہن کے اس رجحان کو بدلنے کے لیے پہلے انہیں چھوٹی چھوٹی بیماریوں کا خاتمہ کرنا ہوگا، اور اس کے لیے اجتماعی کوشش سے پہلے انفرادی کوشش کی ضرورت ہے، اس کے بغیر ساری کوششیں بے سود اور تمام تگ ودو بے کار ہے۔

☆☆☆☆☆

تاریخ ہند

اورنگ زیب عالمگیرؒ، تاریخ کا مظلوم حکمراں

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی

اورنگ زیبؒ کے بارے میں ''جدوناتھ سرکار'' جیسے تنگ نظر، متعصب فرقہ پرست اور حقیقت بے زار مصنف کو بھی یہ کہنا پڑا کہ: ''اورنگ زیب کے اقتدار نے مغل حکومت کے ہلال کو بدرِ کامل بنادیا'' اب اگر کوئی چاند پر تھوکنے کی کوشش کرے تو یہ تھوک اسی کی طرف واپس آئے گا، اس لیے ایسی باتوں سے صرفِ نظر کرجانا نامناسب نہ ہوتا، لیکن مشکل یہ ہے کہ ہندوستان کی نئی تاریخ لکھی جارہی ہے، بلکہ نئی تاریخ بنانے کی کوشش کی جارہی ہے، اس لیے ضروری ہے کہ فرقہ پرست عناصر کو مسئلہ کی اصل حقیقت بتائی جائے اور سچائی کی روشنی پھیلائی جائے۔ برصغیر پر جن مسلم خاندانوں نے حکومت کی ہے، ان میں غالباً سب سے طویل عرصہ مغلوں کے حصہ میں آیا ہے، جو ۱۵۲۶ء سے لے کر ۱۸۵۷ء یعنی تقریباً ساڑھے تین سو سال کے عرصہ پر محیط ہے۔ اس دوران اگرچہ ہمیشہ پورے خطہ پر مغلوں کو دورِ اقتدار حاصل نہیں رہا اور بہت سے علاقے ان کے قبضہ میں آتے اور جاتے رہے، لیکن تقریباً اس پورے عرصہ میں وہ قوتِ اقتدار کی علامت بنے رہے۔ اس خاندان کے چھٹے فرماں روا اورنگ زیب عالمگیرؒ تھے۔ اورنگ زیب عالمگیرؒ ۱۶۸۱ء میں ممتاز محل کے بطن سے پیدا ہوئے اور ۱۷۰۷ء میں وفات پائی، گویا پورے نوے سال کی طویل عمر پائی، پھر ان کی خوش قسمتی ہے کہ ۱۶۵۷ء سے لے کر ۱۷۰۷ء تک یعنی تقریباً پچاس سال انہوں نے حکومت کی اور ان کے عہد میں ہندوستان کا رقبہ جتنا وسیع ہوا، اتنا وسیع نہ اس سے پہلے ہوا اور نہ اس کے بعد، یعنی موجودہ افغانستان سے لے کر بنگلہ دیش کی آخری سرحدوں اور لداخ و تبت سے لے کر جنوب میں کیرالہ تک وسیع و عریض سلطنت کا قیام اسی بادشاہ کی دَین ہے۔ ان کی اخلاقی خوبیوں پر تمام مؤرخین یہاں تک کہ ان کے مخالفین بھی متفق ہیں کہ یہ تخت شاہی پر بیٹھنے والا ایک درویش تھا، جو قرآن مجید کی کتابت اور ٹوپیوں کی سلائی سے اپنی ضروریات پوری کرتا تھا، یہاں تک کہ انہوں نے اپنی موت کے وقت وصیت کی کہ ان کی اسی آمدنی سے تجہیز و تکفین کی جائے۔ ایسے زاہد، درویش صفت، قناعت پسند اور عیش و عشرت سے دور بادشاہ کی نہ صرف ہندوستان بلکہ تاریخِ عالم میں کم مثالیں مل پائیں گی، یہ تو ان کی ذاتی زندگی کے اوصاف ہیں، اس کے علاوہ اورنگ زیبؒ نے اپنے عہد میں غیر معمولی اصلاحات بھی کیں، ترقیاتی کام کیے، نامنصفانہ احکام کو ختم کیا، اور سرکاری خزانوں کو عوام پر خرچ کرنے اور رفاہی کاموں کو انجام دینے کی تدبیر کی، اس سلسلہ میں چند نکات کا ذکر مناسب معلوم ہوتا ہے:

۱- اب تک عوام پر بہت سارے ٹیکس لگائے جاتے تھے، اور یہ صرف مغل حکمرانوں کا ہی طریقہ نہیں تھا، بلکہ اس زمانہ میں جو راجے رجواڑے اور ان کی چھوٹی چھوٹی حکومتیں تھیں، وہ بھی اس طرح کے ٹیکس لیا کرتی تھیں، شیواجی تو اپنے مقبوضہ علاقہ میں چوتھ یعنی پیداوار کا چوتھائی حصہ وصول کیا کرتے تھے، اورنگ زیب عالمگیرؒ نے مال گزاری کے علاوہ جو ٹیکس لیے جاتے تھے، جن کی تعداد اَسّی (۸۰) ذکر کی گئی ہے، ان سب کو نامنصفانہ اور کسان مخالف قرار دیتے ہوئے ختم کردیا، حالاں کہ ان کی آمدنی کروڑوں میں ہوتی تھی، یہ بات قابل غور ہے کہ عام طور پر اورنگ زیبؒ کو ہندو مخالف پیش کیا جاتا ہے، لیکن انہوں نے متعدد ایسے ٹیکسوں کو معاف کردیا، جن کا تعلق ہندوؤں سے تھا، جیسے گنگا پوجا ٹیکس، گنگا اشنان ٹیکس اور گنگا میں مردوں کو بہانے کا ٹیکس۔

۲- انہوں نے مال گزاری کا قانون مرتب کیا اور اس کے نظم و نسق کو پختہ بنایا، یہاں تک کہ شاہ جہاں کے دور میں ڈھائی کروڑ پونڈ کے قریب سلطنت کی آمدنی تھی، تو وہ عالمگیرؒ کے دور میں چار کروڑ پونڈ کے قریب پہنچ گئی۔

۳- حکومتوں میں یہ رواج تھا کہ جب کسی عہدہ دار کا انتقال ہوجاتا تو اس کی ساری جائیداد ضبط کرلی جاتی اور حکومت کے خزانہ میں داخل ہوجاتی، آج بھی بعض مغربی ملکوں میں ایسا قانون موجود ہے کہ اگر کوئی شخص وصیت کے بغیر دنیا سے گزر جائے تو اس کا پورا ترکہ حکومت کی تحویل میں چلا جاتا ہے، عالمگیرؒ نے اس طریقہ کو ختم کیا تاکہ عہدہ دار کے وارثوں کے ساتھ ناانصافی نہ ہو۔

۴- انہوں نے اس بات کی کوشش کی کہ مظلوموں کے لیے انصاف کا حصول آسان

ہوجائے، وہ روزانہ دو تین بار دربارِ عام کرتے تھے، یہاں حاضری میں کسی کے لیے کوئی رکاوٹ نہیں تھی، ہر چھوٹا بڑا، غریب وامیر، مسلمان وغیر مسلم، بے تکلف اپنی فریاد پیش کرسکتا تھا اور بلا تاخیر اس کو انصاف فراہم کیا جاتا تھا، وہ اپنے خاندان کے لوگوں، شہزادوں اور مقرب عہدہ داروں کے خلاف فیصلہ کرنے میں بھی کسی تکلف سے کام نہیں لیتے تھے، لیکن اس کے علاوہ انہوں نے دور دراز کے لوگوں کے لیے ۱۰۸۲ھ میں ایک فرمان کے ذریعہ ہر ضلع میں سرکاری نمائندے مقرر کیے کہ اگر لوگوں کو بادشاہ اور حکومت کے خلاف کوئی دعویٰ کرنا ہو تو وہ ان کے سامنے پیش کریں اور ان کی تحقیق کے بعد عوام کے حقوق ادا کردیں۔

۵- عالمگیرؒ کا ایک بڑا کارنامہ حکومت کی باخبری کے لیے واقعہ نگاری اور پرچہ نویسی کا نظام تھا، جس کے ذریعہ ملک کے کونے کونے سے بادشاہ کے پاس اطلاعات آتی رہتی تھیں، اور حکومت تمام حالات سے باخبر رہ کر مناسب قدم اُٹھاتی تھی، اس نظام کے ذریعہ ملک کا تحفظ بھی ہوتا تھا، عوام کو بروقت مدد بھی پہنچائی جاتی تھی، اور عہدہ داروں کو ان کی غلطیوں پر سرزنش بھی کی جاتی تھی، اس کا سب سے بڑا فائدہ رشوت ستانی کے سدباب کی شکل میں سامنے آیا، عام طور پر حکومت کے اعلیٰ عہدہ داروں کو رشوت ''گفٹ'' کے نام پر دی جاتی ہے، یہ نام کرپشن کے لیے ایک پردہ کا کام کرتا تھا، اُس زمانہ میں یہ رقم نذرانہ کے نام سے دی جاتی تھی، جو بادشاہوں کو حکومت کے عہدہ داران اور اصحاب ثروت کی جانب سے اور عہدہ داروں کو ان کے زیر اثر رعایا کی جانب سے ملا کرتی تھی، اورنگ زیبؒ نے ہر طرح کے نذرانہ پر پابندی لگادی، خاص کر نوروز کے جشن پر تمام امراء بادشاہ کی خدمت میں بڑے بڑے نذرانے پیش کرتے تھے، اورنگ زیبؒ نے اپنی حکومت کے اکیس ویں سال اس جشن ہی کو موقوف کردیا اور فرمان جاری کردیا کہ خود ان کو کسی قسم کا نذرانہ پیش نہ کیا جائے۔

۶- عام طور پر جہاں بھی شخصی حکومتیں رہی ہیں، وہاں عوام کو اطاعت وفرماں برداری پر قائم رکھنے کے لیے بادشاہ کے بارے میں مبالغہ آمیز تصورات کا اسیر بنایا جاتا ہے، اسی لیے تیمور لنگ کہا کرتا تھا کہ جیسے آسمان پر خدا ہے، زمین میں وہی درجہ ایک بادشاہ کا ہے، اسی لیے مغلوں کے یہاں بھی ہندوانہ طریقہ کے مطابق ایک طرح کی بادشاہ پرستی مروّج رہی ہے، اکبر کے یہاں تو بادشاہ کا دیدار اور سجدہ کرنا ایک عبادت تھا اور ہر دن بے شمار لوگ یہ عبادت بجالاتے تھے، جہانگیر نے سجدہ ختم کیا، لیکن زمین بوسی باقی رہی، عالمگیرؒ نے جھروکا درشن بالکلیہ ختم کردیا، جس میں لوگ صبح کو بطورِ عبادت بادشاہ کا دیدار کرتے تھے اور اس وقت تک کھاتے پیتے نہیں تھے، البتہ اس بات کی اجازت تھی کہ اگر کوئی ضرورت مند آئے تو اس کی درخواست رَسّی میں باندھ کر اوپر بادشاہ کے پاس پہنچادی جائے۔

۷- عموماً حکمرانوں کی شاہ خرچی اور حکمرانوں کے چونچلے غریب عوام کی کمر توڑ دیتے ہیں، اورنگ زیب عالمگیرؒ نے ایسے تکلّفات کو ختم کرنے کی بھرپور کوشش کی، جیسا کہ گزرا کہ شاہی نذرانوں کو بند کیا، دربار شاہی میں بادشاہوں کی تعریف کرنے والے شعراء ہوا کرتے تھے اور ان پر ایک ذمہ دار ہوا کرتا تھا، جو ''ملک الشعراء'' کہلاتا تھا، اورنگ زیبؒ نے اس شعبہ کو ختم کردیا، وہ اپنی شان میں کسی بڑائی اور مبالغہ آمیز شاعری کو بالکل پسند نہیں کرتے تھے، بادشاہ کا دل بہلانے کے لیے دربارِ شاہی میں گانے بجانے کا خصوصی انتظام ہوتا تھا، قوال اور رقاصائیں گاکر اور ناچ کر بادشاہ کا دل خوش کرتی تھیں اور ان پر بڑی بڑی رقمیں خرچ کی جاتی تھیں، عالمگیرؒ نے اس سلسلہ کو بھی موقوف کردیا، بادشاہ کے لکھنے کے لیے سونے اور چاندی کی دواتیں رکھی جاتی تھیں، عالمگیرؒ نے اس کے بجائے چینی کی دواتیں رکھنے کی تلقین کی، انعام کی رقمیں چاندی کے بڑے طشت میں لائی جاتی تھیں، اس طشت کی رسم کو بھی اورنگ زیبؒ نے موقوف کردیا، عام طور پر بادشاہوں کی جیب خرچ کے لیے کروڑوں روپے کی آمدنی مخصوص کردی جاتی تھی، آج بھی جمہوری ملکوں میں سربراہِ حکومت کے لیے رہائش، سفر اور ضروریات وغیرہ پر جو رقمیں صرف کی جاتی ہیں اور رہائش کے لیے جو وسیع مکان اور اعلیٰ درجہ کی سہولت فراہم کی جاتی ہے، وہ گزشتہ بادشاہوں کی شاہ خرچی کو بھی شرمندہ کرتی ہیں، لیکن اورنگ زیب عالمگیرؒ نے اپنے لیے نہ کوئی عظیم الشان محل تعمیر کرایا، نہ اپنی تفریح کے لیے کوئی باغ بنوایا، اور اپنے مصارف کے لیے بھی محض چند گاؤں کو اپنے حصہ میں رکھا اور بقیہ سارے مصارف کو حکومت کے خزانہ میں شامل کردیا۔

۸- انہوں نے تعلیم کی ترقی پر خصوصی توجہ دی، ہر شہر اور ہر قصبہ میں اساتذہ مقرر ہوئے، نہ صرف اساتذہ کے لیے وظائف مقرر کیے گئے اور جاگیریں دی گئیں، بلکہ طلبہ کے اخراجات اور مددِ معاش کے لیے بھی حکومت کی طرف سے سہولتیں

فراہم کی گئیں، کہا جاتا ہے کہ اورنگ زیبؒ کے زیادہ تر فرامین تعلیم ہی سے متعلق ہیں، جن کو ان کے بعض تذکرہ نگاروں نے نقل بھی کیا ہے۔

۹-اس زمانہ میں صنعت وحرفت کو آج کی طرح ترقی نہیں ہوئی تھی اور معیشت کا سب سے بڑا ذریعہ زراعت تھی، اورنگ زیبؒ نے زرعی ترقی پر خصوصی توجہ دی، کسانوں کی حوصلہ افزائی کی، جن کسانوں کے پاس کاشت کاری کے لیے پیسہ نہیں ہوتا، ان کو سرکاری خزانوں سے پیسہ فراہم کیا جاتا، حسبِ ضرورت کسانوں سے مال گزاری معاف کی گئی جو زمینیں اُفتادہ تھیں اور ان میں کاشت نہیں کی جاتی تھی، ان کو ایسے کسانوں کے حوالہ کیا گیا، جو اُن کو آباد کرنے کے لیے آمادہ تھے، اپنے عہدہ داروں کو ہدایت کی کہ کسانوں کو اتنا ہی لگان لگایا جائے، جتنا وہ بآسانی اور بخوشی ادا کرسکیں، اگر وہ نقد کے بجائے جنس دینا چاہیں تو قبول کرلیا جائے، انہوں نے کسانوں کے لیے کنواں کھدوانے، قدیم کنوؤں کو درست کرانے اور آب پاشی کے وسائل کو بہتر بنانے کو حکومت کی ایک ذمہ داری قرار دیا، انہوں نے زمین کے سروے کرنے پر خصوصی توجہ کی تاکہ معلوم ہو کہ کون سی اراضی اُفتادہ ہیں اور اُن کو قابل کاشت بنانے کی کیا صورت ہے؟ انہوں نے اپنے فرمان میں لکھا ہے: ’’بادشاہ کی سب سے بڑی خواہش اور آرزو یہ ہے کہ زراعت ترقی کرے، اس ملک کی رزعی پیداوار بڑھے، کاشت کار خوش حال ہوں اور عام رعایا کو فراغت نصیب ہو، جو خدا کی طرف سے امانت کے طور پر ایک بادشاہ کو سونپی گئی ہے۔‘‘ زرعی پیداوار کی طرف اسی توجہ کا نتیجہ تھا کہ اورنگ زیب عالمگیرؒ کے دور میں فتح ہونے والے بہت سے علاقے ایسے تھے، جہاں کے اخراجات وہاں کی آمدنی سے زیادہ تھے، لیکن پھر بھی کہیں غذائی اشیاء کی قلت محسوس نہیں کی گئی، اگر یہ صورتِ حال نہیں ہوتی تو اتنے طویل و عریض رقبہ پر پچاس سال تک اورنگ زیبؒ حکومت نہیں کرپاتے اور وہ عوام کی بغاوت کے نتیجہ میں مملکت پارہ پارہ ہوجاتی۔

۱۰-اورنگ زیبؒ کا ایک بڑا کارنامہ سماجی اصلاح بھی ہے، انہوں نے بھنگ کی کاشت پر پابندی لگائی، شراب و جوئے کی ممانعت کردی، قحبہ گری کو روکا اور فاحشہ عورتوں کو شادی کرنے پر مجبور کیا۔ لونڈی، غلام بنا کر رکھنے یا خواجہ سرا رکھنے پر پابندی لگائی۔

۱۱-ہندو سماج میں عرصۂ دراز سے ستی کا طریقہ مروّج تھا، جس کے تحت شوہر کے مرنے کے بعد بیوی شوہر کی چتا کے ساتھ نذرِ آتش کردی جاتی تھی، ہندو سماج میں اُسے مذہبی عمل سمجھا جاتا تھا، مغلوں نے ہمیشہ اس کا خیال رکھا کہ غیر مسلموں کے مذہبی معاملات میں مداخلت نہ کی جائے، اس لیے اورنگ زیبؒ نے قانونی طور پر اس کو بالکلیہ تو منع نہ کیا، لیکن اصلاح اور ذہن سازی کا طریقہ اختیار کرتے ہوئے عہدہ داروں کو ہدایت دی کہ وہ عورتوں کو اس رسم سے باز رکھنے کی کوشش کریں اور اپنی خواتین کے ذریعہ بھی ان کو اس کی دعوت دیں، نیز پابندی عائد کردی کہ علاقہ کے صوبہ دار کی اجازت کے بغیر ستی نہ کی جائے، تاکہ کسی عورت کو اس عمل پر اس کے میکہ یا سسرال والے یا سوسائٹی کے دوسرے لوگ مجبور نہ کرسکیں، اس طرح عملاً ستی کا رواج تقریباً ختم ہوگیا۔ غرض کہ اورنگ زیبؒ نے قدیم سڑکوں اور سرایوں کی مرمت، نئی سڑکوں اور مسافر خانوں کی تعمیر، تعلیمی اداروں اور عبادت گاہوں کو جاگیروں کے عطیہ وغیرہ کے جو رفاہی کام کیے، ان کے علاوہ مختلف دوسرے میدانوں میں جو خدمتیں انجام دی ہیں، وہ بھی آب زر سے لکھے جانے کے لائق ہیں۔ ان کی رحم دلی، انصاف پروری اور عفو و درگزر کا ان لوگوں نے بھی اعتراف کیا ہے، جو اُن کو ایک خشک مزاج، ناروادار اور سخت گیر حکمراں قرار دیتے ہیں۔ انہوں نے ہمیشہ اپنے حریفوں کے ساتھ خواہ وہ مسلمان ہوں یا غیر مسلم، سنی ہوں یا شیعہ، پٹھان ہوں یا مراٹھے وراجپوت، زیادہ سے زیادہ صلح اور درگزر کی پالیسی اختیار کی، خود شیواجی کو جس طرح انہوں نے بار بار معاف کیا اور اس کے بیٹے کو گلے لگایا، یہ اس کی بہترین مثال ہے۔ مگر افسوس کہ انگریزوں نے ہندوستان کی دو بڑی قوموں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان نفرت کی دیوار قائم کرنے کی جو منصوبہ بند کوشش کی، اس میں مغلوں کے دورِ حکومت کو عموماً اور آخری پُر شوکت مغل بادشاہ اورنگ زیبؒ (جس کو انگریز اپنے راستہ میں رکاوٹ سمجھتے تھے) کے بارے میں خصوصاً بڑی غلط فہمیاں پھیلائیں اور بعض مصنّفین نے ان کا آلۂ کار بنتے ہوئے ایسی کتابیں تصنیف کیں، جن کو تاریخ اور واقعہ نگاری کے بجائے ناول نگاری اور افسانہ نویسی کہا جائے تو زیادہ مناسب ہوگا، انہوں نے ایسی بے بنیاد باتیں لکھ دیں جن کا حقیقت اور واقعہ سے کوئی تعلق نہیں۔

اورنگ زیبؒ کو ایک ہندو دشمن حکمراں کی حیثیت سے پیش کیا گیا اور اس کے لیے اورنگ زیبؒ اور شیواجی کی جنگ کو بنیاد بنایا گیا،

حالاں کہ یہ ایک سیاسی جنگ تھی نہ کہ مذہبی۔ اور نگ زیبؒ اور شیواجی کی جنگ میں اورنگ زیبؒ کا سب سے معتمد کمانڈر ایک راجپوت راجہ جے سنگھ تھا، اور بے شمار راجپوت اور مراٹھے سردار اورنگ زیبؒ کے ساتھ تھے اور ان کی فوج میں بھی بڑی تعداد پٹھانوں، راجپوتوں اور شیواجی کے مخالف مراٹھوں کی تھی، اورنگ زیبؒ کے عہد میں جو غیر مسلم حکومت کے اعلیٰ ترین عہدوں پر رہے ہیں، ان میں کئی مرہٹے ہیں، جن میں شیواجی کے داماد اور بھتیجے بھی شامل ہیں، علامہ شبلیؒ نے ان کا نام بہ نام ذکر کیا ہے، جن کی تعداد ۲۶ رہے، خود شیواجی کو بھی اورنگ زیبؒ نے پنج ہزاری منصب عطا کیا تھا، جو بڑا منصب تھا، اور جس پر بادشاہ کے بعض شہزادے، قریبی رشتہ دار اور معتمد عہدہ دار فائز تھے، البتہ شیواجی ہفت ہزاری چاہتے تھے، مگر راجپوت اور پٹھان اعیانِ حکومت اس کے حق میں نہیں تھے۔ تصویر کا دوسرا رُخ یہ ہے کہ شیواجی جو مغلوں کے خلاف گوریلا جنگ لڑا کرتے تھے، وہ گاؤں کے گاؤں لوٹ لیا کرتے تھے، قلعوں کو تاخت و تاراج کردیا کرتے تھے، یہ لوٹ مار ان کی مستقل حکمت عملی تھی، اس میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی کوئی تفریق نہیں ہوا کرتی تھی، سورت اس زمانہ میں جنوبی ہند کی سب سے بڑی منڈی تھی، جو بیرونی ممالک سے درآمد و برآمد کا بہت بڑا ذریعہ تھا، یہاں غالب آبادی ہندوؤں کی تھی، شیواجی موقع بموقع وہاں ایسا حملہ کرتے تھے کہ پورا شہر ویران ہوجاتا تھا، کیا ہندو کیا مسلمان اور کیا ملکی اور کیا غیر ملکی؟ سب کے سب ان حملوں سے پناہ چاہتے تھے، ان حملوں میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی کوئی تفریق نہیں تھی، بلکہ تاجروں کی غالب تعداد ہندوؤں کی تھی، اس لیے ان کو زیادہ نقصان اٹھانا پڑتا تھا، یہاں تک کہ شیواجی جن کو مراٹھوں کا نجات دہندہ سمجھا جاتا ہے، خود مراٹھوں کے خلاف بھی انہوں نے وہی کیا، جو ہر بادشاہ اپنے اقتدار کی حفاظت کے لیے کیا کرتا ہے، بیجاپور کے پہلے سلطان نے ایک مراٹھے خاندان کو ''جاولی'' کا علاقہ عطا کیا، جس نے ایک مضبوط ریاست بنائی اور یہ بتدریج کوکن کے پورے علاقہ پر قابض ہوگیا، اس خاندان کے راجا کا خاندانی لقب چندر راؤ تھا، شیواجی کا احساس تھا کہ جب تک چندر راؤ کا قتل نہ کیا جائے اور اس کی سلطنت پر قبضہ نہ ہوجائے، شیواجی جس وسیع سلطنت کا منصوبہ رکھتے ہیں، وہ شرمندۂ تعبیر نہیں ہوسکتا، اس لیے اس نے دھوکہ دے کر اس مرہٹہ راجا کو قتل کیا، اس کے بھائی کو زخمی کیا اور اس کی سلطنت پر قابض ہوگئے۔ غرض کہ اورنگ زیبؒ اور شیواجی کی جنگ کوئی مذہبی جنگ نہیں تھی، بلکہ ایک سیاسی جنگ تھی، جو حکمرانوں کے درمیان ہمیشہ ہوتی رہی ہے، نہ اورنگ زیبؒ نے اسلامی نقطۂ نظر سے یہ جنگ لڑی ہے اور نہ شیواجی کا حملہ ہندوؤں کے وقار کی حفاظت کے لیے ہوا ہے۔ اورنگ زیبؒ پر ایک الزام یہ لگایا جاتا ہے کہ انہوں نے ہندوؤں کی عبادت گاہوں کو منہدم کیا ہے اور مندر شکنی کے مرتکب ہوئے ہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اورنگ زیبؒ کے عہد میں بعض مندر منہدم کیے گئے ہیں، لیکن اس بات پر بھی غور کرنا چاہیے کہ اس کا سبب کیا تھا؟ غیر جانب دار مؤرخین نے لکھا ہے کہ اورنگ زیبؒ نے انہیں مندروں کو منہدم کیا تھا، جو غیر قانونی طور پر بنائے گئے تھے، مثلاً اور چھا میں ببر سنگھ دیو کے بنائے ہوئے ایک مندر کو اورنگ زیبؒ نے منہدم کرادیا، لیکن اس لیے کہ ببر سنگھ دیو نے اولاً تو ظالمانہ طور پر ابوالفضل کو قتل کیا اور پھر اسی کے سرمایہ سے وہ مندر بنایا۔ یہی وجہ ہے کہ جب وہ مندر منہدم کیا گیا تو وہاں کے راجہ دیوی سنگھ نے کوئی اعتراض نہیں کیا، یا اس نے ایسے مندروں کو گرایا، جہاں حکومتوں کے خلاف سازشیں کی جاتی تھیں، یا ایسے مندروں کو جہاں غیر اخلاقی حرکتیں کی جاتی تھیں، جیسے بنارس کا وشوناتھ مندر، ڈاکٹر بی، ایم، پانڈے نے اس کی تاریخ اس طرح بیان کی ہے کہ اورنگ زیبؒ جب بنگال جاتے ہوئے بنارس کے قریب سے گزرے تو اس کی فوج میں شامل ہندو راجاؤں اور کمانڈروں نے وہاں ایک دن قیام کی درخواست کی، تاکہ ان کی رانیاں گنگا اشنان کرسکیں اور وشوناتھ دیوتا کی پوجا کریں، اورنگ زیبؒ راضی ہوگئے، انہوں نے فوج کے ذریعہ حفاظت کا پورا انتظام کیا، رانیاں اشنان سے فارغ ہوکر وشوناتھ مندر روانہ ہوئیں، لیکن جب مندروں سے رانیاں واپس ہوئیں تو اس میں بعض موجود نہیں تھیں، کافی تلاش کی گئی، مگر پتہ نہیں چل سکا، بالآخر تحقیق کاروں نے دیوار میں نصب گنیش کی مورتی کو ہلایا، جو اپنی جگہ سے ہلائی جاسکتی تھی تو نیچے سیڑھیاں نظر آئیں، یہ سیڑھیاں ایک تہہ خانہ کی طرف جاتی تھیں، وہاں انہوں نے دیکھا کہ بعض رانیوں کی عصمت ریزی کی جاچکی ہے اور وہ زار و قطار رو رہی ہیں، چناں چہ اورنگ زیبؒ کی فوج میں شامل راجپوت کمانڈروں نے اس مندر کو منہدم کردینے کا مطالبہ کیا، اورنگ زیبؒ نے حکم دیا کہ مورتی کو پورے احترام کے ساتھ دوسری جگہ منتقل کردیا جائے اور چوں کہ ایک مقدس مذہبی مقام کو

ناپاک کیا گیا ہے، اس لیے اس کو منہدم کردیا جائے اور مہنت کو گرفتار کرکے سزا دی جائے۔ یہ بھی ملحوظ رہے کہ اکبر کے دور سے صورتِ حال یہ تھی کہ بہت سی مسجدوں کو منہدم کرکے بت خانے بنادیے جاتے تھے، ہندو مسلمان عورتوں سے جبراً نکاح کرتے تھے اور انہیں اپنے تصرف میں لاتے تھے۔ جہانگیر اور شاہ جہاں کے دور میں بھی یہی صورتِ حال باقی رہی اور خود اورنگ زیبؒ کی حکومت کے بارہویں سال تک یہی صورتِ حال تھی، ممکن ہے کہ بعض مندروں کے انہدام کا یہی پس منظر ہو۔ چناں چہ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اورنگ زیبؒ نے جہاں مندر منہدم کیے ہیں، وہیں مسجد بھی منہدم کروائی ہے، کہا جاتا ہے کہ سلطنت گولکنڈہ کے مشہور فرماں روا تانا شاہ نے سال ہا سال سے شہنشاہِ دہلی کو شاہی محصول ادا نہیں کیا تھا، اس نے اپنی دولت کو چھپانے کے لیے ایک بڑا خزانہ زیرِ زمین دفن کرکے اس پر جامع مسجد گولکنڈہ تعمیر کرادی، اورنگ زیبؒ کو کسی طرح اس کی اطلاع ہوئی تو اس نے اس مسجد کو منہدم کرادیا، اور اس خزانہ کو رفاہِ عام کے کاموں میں صرف کردیا۔ افسوس کہ فرقہ پرست، متعصب اور دروغ گو تذکرہ نگاروں نے اورنگ زیبؒ کی اس سخاوت اور وسیع النظری کا تذکرہ نہیں کیا، جو ان کا اصل مزاج تھا۔ کاش! فرقہ پرست عناصر کبھی اس بات پر بھی غور کرتے کہ خود ہندوؤں نے کس طرح بودھوں کی خانقاہوں، جینوں کے مندروں اور مسلمانوں کی مسجدوں کو منہدم کیا ہے۔ خود شیواجی نے ستارہ، پارلی، اور زیرِ قبضہ آنے والے علاقوں میں مسجدوں کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ ایلورا اور اجنتا میں بودھوں کو یہ کیوں کرنا پڑا کہ اپنی عظیم الشان خانقاہوں کو مٹی سے ڈھانپ دیں، تاکہ وہ ہندوؤں کی دست برد سے محفوظ رہ سکیں۔ آج بھی جگن ناتھ مندر ہندوؤں کی زیادتی کی گواہ بن کر کھڑا ہے، جو دراصل بودھوں کا مندر تھا، اور جس پر زبردستی ہندوؤں نے قبضہ کرلیا۔ ۱۹۴۷ء اور ۱۹۴۸ء میں ہزاروں مسجدیں شہید کردی گئیں، اندرا گاندھی کے دور میں سکھوں کی سب سے بڑی عبادت گاہ گولڈن ٹمپل اور اکال تخت کی اینٹ سے اینٹ بجادی گئی، گجرات کے ۲۰۰۲ء کے فساد میں کتنی ہی مسجدیں شہید کردی گئیں اور حکومت نے اس کی تعمیرِ نو کرنے سے انکار کردیا، کیا فرقہ پرست عناصر سچائی کی نشان دہی کرنے والے اس آئینہ میں بھی اپنا چہرہ دیکھنا گوارہ کریں گے؟ اورنگ زیبؒ کے فردِ جرم میں اس بات کو بھی شامل کیا گیا ہے کہ انہوں نے ہندوؤں پر جزیہ لگادیا تھا، لیکن اس بات پر غور نہیں کیا گیا کہ انہوں نے اَسّی (۸۰) قسم کے ٹیکس معاف کردیے، جن میں کئی ٹیکسوں کا تعلق ہندوؤں سے تھا اور جزیہ اُن پر اس لیے عائد کیا گیا کہ مسلمانوں سے زکوٰۃ لی جاتی تھی، اگر ہندوؤں سے بھی زکوٰۃ لی جاتی تو یہ ان کو ایک اسلامی عمل پر مجبور کرنا ہوتا، اور مذہبی آزادی کے تقاضے کے خلاف ہوتا، اس لیے اسلام نے غیر مسلم شہریوں پر الگ نام سے یہ ٹیکس مقرر کیا ہے اور اس کی مقدار نہایت قلیل ہے: فی کس بارہ درہم سے بھی کم، پھر شریعت کے حکم کے مطابق اورنگ زیبؒ نے عورتوں، بچوں، مذہبی پیشواؤں، معذوروں اور غریبوں کو اس سے مستثنیٰ رکھا اور جزیہ کے بدلہ غیر مسلم عوام کے تحفظ کی گارنٹی دی گئی، ان سب کے باوجود ہمیں یہ حقیقت ذہن میں رکھنی چاہیے کہ اورنگ زیبؒ کوئی عالم، مفتی اور صوفی نہ تھے، بلکہ ایک سیاسی قائد اور حکمراں تھے، بھائیوں کا قتل ہو یا بعض سکھ رہنماؤں کا، مندروں کا انہدام ہو یا مسجدوں کا، یہ سیاسی مقاصد کے تحت تھے، یہ غلط ہوسکتے ہیں، لیکن اس کو مذہب کی جنگ قرار دینا اس سے زیادہ غلط ہے، اورنگ زیب سے متعلق جو الزامات ہیں، وہ علم وتحقیق کے بجائے غلط فہمی اور جذبات پر مبنی ہیں، جو لوگ اس معاملہ کی سچائی کو جاننا چاہیں اور غیر جانب دارانہ مطالعہ کرنا چاہیں، انہیں علامہ شبلی نعمانیؒ کی ''اورنگ زیب عالمگیرؒ پر ایک نظر''، سیّد صباح الدین عبدالرحمٰنؒ کی ''مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری'' (جلد سوم)، مولوی ذکاء اللہ کی ''اورنگ زیب عالمگیرؒ'' اور مولانا نجیب اشرف ندوی کی ''مقدمہ رقعات عالمگیر'' کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ لیکن اس وقت ایک بڑا کام یہ ہے کہ کچھ حقیقت پسند، غیر جانب دار لکھنے والے اُٹھیں اور سندھ میں مسلمانوں کی آمد سے لے کر برطانیہ سے ہندوستان کی آزادی تک کی تاریخ اس طور پر لکھیں، جو فرقہ وارانہ تاثرات سے خالی ہو، جس میں ہر طبقہ کی خدمات کا اعتراف کیا جائے، جس میں بادشاہوں اور راجاؤں کی جنگ کو ایک سیاسی جنگ کی نظر سے دیکھا جائے نہ کہ مذہبی جنگ کی حیثیت سے، جس میں مسلمانوں کے درمیان باہمی رواداری اور اخوت و بھائی چارہ کو نمایاں کیا جائے، جو محبت کی خوش بو بکھیرے نہ کہ نفرت کا تعفن، یہ ایک ضروری کام ہے، جس کی طرف تحقیقاتی اکیڈمیوں، تعلیمی اداروں، ملّی تنظیموں، قومی اداروں اور باصلاحیت اور منصف مزاج دانش وروں کو توجہ دینی چاہیے۔

☆☆☆☆☆

علم وعمل

انسانی سماج میں علم کی اہمیت

اور مسلمانوں کا فرض منصبی

مولانا سید بلال عبدالحی حسنی ندوی

انسانی سماج کے لیے علم کی اہمیت آج ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے، لیکن اس کا آوازہ سب سے پہلے اسلام نے بلند کیا، نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم پر سب سے پہلی وحی میں علم کی طرف توجہ دلائی گئی اور پڑھنے کا حکم دیا گیا اور قلم کا تذکرہ کیا گیا، ارشاد ہو:

"اقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ، خَلَقَ الْإِنسَانَ مِنْ عَلَقٍ، اقْرَأْ وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ، الَّذِي عَلَّمَ بِالْقَلَمِ، عَلَّمَ الْإِنسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ" [العلق: ۱-۵] (پڑھئے اپنے اس پروردگار کے نام سے جس نے پیدا کیا جس نے انسان کو خون کے ایک لوتھڑے سے بنایا، پڑھتے جایئے اور آپ کا پروردگار سب سے زیادہ کرم والا ہے جس نے قلم سے علم سکھایا، انسان کو وہ سکھایا جو وہ جانتا نہ تھا)۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ دین اسلام میں علم کی خاص اہمیت ہے، لیکن علم کے لیے یہ شرط ہے کہ اس کا رشتہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے نام کے ساتھ مربوط ہو، یہی وجہ ہے کہ اس امت کا علم سے بہت گہرا و مضبوط تعلق رہا ہے، علوم وفنون کے استحکام وترقی کی شاہ کلید تو قرآن مجید کی یہ پہلی آیت ہے جس سے وحی کا آغاز ہوتا ہے، سب سے پہلے اس میں پڑھنے ہی کا حکم دیا گیا ہے، اور قلم کا تذکرہ کیا گیا ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم وتعلم کی بڑی اہمیت بیان فرمائی ہے، بدر کے قیدیوں کا یہی فدیہ متعین کیا گیا تھا کہ ان میں جو پڑھے لکھے ہوں وہ بچوں کو تعلیم دیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض صحابہ کو عبرانی اور دوسری زبانیں سیکھنے کا بھی حکم فرمایا تھا، تمام مذاہب میں اسلام نے علم کی اہمیت جس طرح اجاگر کی ہے اور اس کو طاقت بہم پہنچائی ہے، دنیا کا کوئی مذہب اس کا عشر عشیر پیش کرنے سے قاصر ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دور ہی سے علم کی ترقی کا سلسلہ شروع ہوا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے علم کے جو بنیادیں فراہم کیں، بعد میں اس پر بڑے بڑے محلات اور فلک بوس عمارتیں تعمیر ہوئیں، اور واقعہ یہ ہے کہ اسلام نے جس طرح دنیا کو علم سے بھر دیا اس کی نظیر کسی دوسرے مذہب یا مکتب فکر میں نہیں ملتی، اسلام کا یہ بھی امتیاز ہے کہ اس نے صحیح بنیادوں پر علم کو آگے بڑھایا، اور اس کے ساتھ عظمت رب شامل کی، پہلی ہی وحی میں "اقْرَأْ" (پڑھئے) کے ساتھ "بِاسْمِ رَبِّكَ" (اپنے رب کے نام سے) کی شرط لگادی گئی تاکہ انسان بے مہار نہ ہو اور علم کا استعمال بے جا نہ ہو سکے۔

عرصہ دراز تک تمام علوم کی زمام مسلمانوں کے ہاتھ میں رہی، اور انسانیت کو ان علوم سے کما حقہ نفع حاصل ہوتا رہا، کیونکہ ان کے پاس علم کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے بیان کردہ وہ احکامات بھی تھے، جن میں انسانیت کا درس دیا گیا ہے، اور وہ نظام اخلاق بھی تھا جو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ کا عکس ہے، تاریخ میں آتا ہے کہ جس وقت بغداد میں مسلمانوں کی حکومت تھی، وہاں خدمت خلق کے لیے بڑے بڑے ہاسپٹلس قائم تھے، انہیں میں ایک بہت بڑا ہاسپٹل "بیمارستان" کے نام سے تھا، اس میں مختلف ڈپارٹمنٹس قائم تھے، انہیں میں ایک ایسا ڈپارٹمنٹ بھی تھا، جس میں باقاعدہ کچھ لوگوں کو اس غرض سے رکھا جاتا تھا کہ وہ مریض کے کمرہ کے آس پاس بیٹھ کر اس کے متعلق ایسی باتیں کریں جن سے اس کو نفسیاتی طور پر تقویت حاصل ہو، لیکن آج اس کے بالکل برعکس نظر آتا ہے، اب حالت یہ ہے کہ اگر کوئی مریض ڈاکٹر کے پاس Checkup کے لیے جائے، تو بجائے اس کے کہ رپورٹ دیکھنے کے بعد ڈاکٹر تسلی کے چند کلمات کہے، اس کو سخت تشویش میں ڈال دیتا ہے، بسا اوقات ایسے سخت کلمات بھی زبان سے کہہ دیتا ہے جن کو سن کر مریض کی طبیعت میں اچانک گراوٹ پیدا ہو جاتی ہے، اس کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ علم ہے لیکن علم کی روح نہیں ہے، ٹیکنالوجی میں انسان آسمان کی بلندیوں کی طرف جا رہا ہے مگر اخلاق میں اس کی سطح بعض مرتبہ جانوروں سے بھی نیچے نظر آتی ہے، چونکہ مسلمانوں کے پاس علم کے ساتھ اخلاقی نظام بھی تھا، اس لیے ان کے یہاں ایسی سوہان روح حرکتیں نہیں تھیں، بلکہ انہوں نے اس بات کی کوشش کی کہ علم کو زیادہ سے زیادہ اخلاقیات سے مربوط کیا جائے، تاریخ میں اس قبیل کی بے شمار مثالیں موجود ہیں، جن کے مطالعہ سے حیرت ہوتی ہے کہ مسلمانوں نے علم کو کس حد تک ترقی دی تھی اور عالم انسانیت کو اس

سے کس قدر فائدہ پہنچا تھا۔

علم نافع یا غیر نافع

حاصل یہ کہ جب تک مسلمانوں کے ہاتھ میں علم رہا اس وقت تک علم ساری دنیائے انسانیت کے لیے باعث رحمت تھا، مسلمانوں نے علم کے ذریعہ صرف یہی نہیں کہ محض علمی فائدہ اٹھایا، بلکہ تجرباتی طور پر انسانیت کو بیش قیمت تحفے دیے، اخلاقی طور پر اس کے لیے ایسے حدود قائم کیے جس کی بنیاد پر کوئی شخص علم کا Misuse نہ کر سکے، یعنی اس کا غلط استعمال نہ ہو، اس کی افادیت کے دروازے بند نہ کیے جائیں، اس سے دوسروں کو فائدہ پہنچایا جائے، اسی لیے حدیث میں آتا ہے:

"من کتم علماً تلجم بلجام من نار" [صحیح ابن حبان: ۹۵] (جو علم کو چھپائے گا اس کو آگ کی لگام لگائی جائے گی)۔

یہاں یہ بات ذہن نشیں رہے کہ ہر علم نافع ہے، کوئی بھی علم غیر نافع نہیں، لیکن علم غیر نافع اور مضر اس وقت ہوتا ہے جب وہ ان ہاتھوں میں پہنچ جائے جو اس کا غلط استعمال کرتے ہوں، ان کے غلط استعمال سے اس علم کے نامناسب مظاہر معاشرہ میں رونما ہوتے ہیں، پھر یہ کہا جاتا ہے کہ علم نقصان پہنچا رہا ہے، حالانکہ علم نقصان نہیں پہنچاتا، علم فائدہ ہی پہنچاتا ہے، لیکن جو لوگ اس کا استعمال کرتے ہیں اس سے فرق پڑتا ہے، کوئی اس سے فائدہ اٹھاتا ہے فائدہ پہنچاتا ہے، کوئی اس سے فائدہ اٹھاتا ہے نقصان پہنچاتا ہے، کوئی اس سے خود بھی نقصان اٹھاتا ہے اور ساری انسانیت کو نقصان پہنچاتا ہے، اور کوئی اس سے نہ خود فائدہ اٹھاتا ہے، نہ فائدہ اٹھانے دیتا ہے۔

آگ جلاتی ہے اس کا علم اپنی جگہ مفید ہی ہے، مگر کوئی اس کا استعمال کھانا پکانے کے لیے اور چراغ روشن کرنے کے لیے کرتا ہے، فائدہ اٹھاتا ہے اور فائدہ پہنچاتا ہے، اور کوئی اس کا استعمال کسی کا گھر جلانے اور کسی کو تباہ کرنے کے لیے کرتا ہے، علم اپنی جگہ مفید تھا مگر اس کے غلط استعمال نے اس کو بگاڑ دیا، پانی سے پیاس بجھتی ہے، ایک انسان اس کا علم رکھتا ہے مگر وہ خود نہ اپنی پیاس بجھاتا ہے، اور نہ دوسرے کی پیاس بجھنے دیتا ہے، البتہ یہ نافعیت دنیا کے اعتبار سے بھی ہے، اور آخرت کے اعتبار سے بھی، دنیا و آخرت کی کامیابی کے طریقے اس سے معلوم ہوتے ہیں، پھر آدمی ان طریقوں سے فائدہ نہ اٹھائے، اور دوسروں کو نہ بتائے تو ایسے ہی علم سے پناہ مانگی گئی ہے: "اللّٰھم انی أعوذ بك من علم لا ینفع" [سنن ابن ماجۃ: ۲۵۸] (اے اللہ! میں ایسے علم سے تیری پناہ چاہتا ہوں جو فائدہ نہ دے)۔

علم کا کام فائدہ پہنچانا تھا، اب اگر اس سے فائدہ نہ اٹھایا جائے اور اپنی زندگی کی گاڑی اس کی روشنی میں صحیح رخ پر نہ لائی جائے تو ایسے علم کا کیا حاصل؟..... اس لیے اس علم سے پناہ مانگی گئی ہے۔

افسوس کا مقام ہے کہ جن مسلمانوں نے علم سے غیر معمولی فائدہ اٹھایا، اور پوری انسانیت کو ایسے تحفے دیے جن کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا، آج انہیں مسلمانوں نے علم سے اپنا رشتہ توڑ لیا، نتیجہ یہ ہوا کہ علم ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں چلا گیا جو اخلاق سے نا آشنا تھے، انسانیت کے درد سے ناواقف تھے، صحیح فہم سے دور تھے، جن کو اس بات کا بھی شعور نہ تھا کہ ایک انسان کے اندر کیسا دھڑکتا ہوا دل ہوتا ہے، آپس میں کیسی محبتیں ہوتی ہیں، اور ایک انسان دوسرے انسان کو فائدہ پہنچا کر کیسا سکون محسوس کرتا ہے، یہ سب وہ چیزیں ہیں کہ علم جن قوموں کے ہاتھ میں گیا وہ ان تمام باتوں سے ناواقف تھیں، یہی وجہ ہے کہ گرچہ ان قوموں نے علم، سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں ترقی کی، مگر ان علوم کو اخلاق کی وہ روشنی نہ ملی جن سے انسانیت نوازی کا کام ہوتا، نتیجہ یہ ہوا کہ ٹیکنالوجی کے میدان میں ترقی کی بنیاد پر ایسے بم ایجاد کیے گئے جن سے پوری انسانیت خطرہ میں ہے، ماہرین کا کہنا ہے کہ ان بموں میں سات مرتبہ دنیا تباہ کرنے کی صلاحیت ہے۔

دیگر مذاہب کی علم سے دوری

بعثت سے پہلے کی تاریخ کا مطالعہ کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس وقت کے بڑے بڑے مذاہب بھی علم سے کوسوں دور تھے، عیسائیت، یہودیت یا بعض دوسرے ایسے خود ساختہ مذاہب جن کی کوئی حقیقت نہ تھی، ان کا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان تمام مذاہب میں علم کا فقدان تھا، آج یہودی اور عیسائی سب سے زیادہ ترقی یافتہ و تعلیم یافتہ سمجھے جاتے ہیں، تعلیم کی باگ ڈور انہیں کے ہاتھ میں ہے، واضح رہے کہ یہ صورت حال ہمیشہ سے نہیں تھی، بلکہ تاریخ کا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ آج سے تقریباً آٹھ سو سال پہلے پورا یورپ تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا، خود مغربی مفکرین اپنے اس جاہلی دور کو Dark Ages (تاریک صدیاں) سے تعبیر کرتے ہیں، رابرٹ بریفالٹ (Robert Briffault) لکھتا ہے:

"پانچویں صدی سے لے کر دسویں صدی تک یورپ پر گہری تاریکی چھائی ہوئی تھی اور یہ تاریکی تدریجاً زیادہ گہری اور بھیانک ہوتی جا رہی تھی..... اٹلی اور فرانس جیسے شہروں میں

طوائف الملوکی اور ویرانی کا دور دورہ تھا‘‘۔ [عروج وزوال کا اثر، صفحہ: ۳۸، بحوالہ کتاب The Making Of Humanity]

یہ وہ زمانہ تھا جس میں ان کے پاس علم کی کوئی روشنی نہیں تھی، یہ آخری درجہ کی بات ہے کہ ان کو اپنے مذہبی لوگوں (پوپ یا پروہت) کی طرف سے علم حاصل کرنے کی کوئی اجازت نہ تھی، ان کی علم دشمنی کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ اگر ان میں کوئی شخص علم حاصل کرتا تو اس کو سخت سزائیں دی جاتیں، اس کا نتیجہ یہ تھا کہ ان کے یہاں کسی قسم کا علم موجود نہ تھا، یہی وجہ ہے کہ اگر ان لوگوں میں کوئی شخص بیمار ہوجاتا تو اس کو کسی جنگل میں یہ سمجھ کر ڈال دیتے کہ اگر اس کو اچھا ہونا ہے تو اچھا ہوجائے گا، ورنہ مرجائے گا، گویا علم سے دوری کے سبب ان کے پاس ایسا کوئی طریقۂ علاج نہ تھا جس سے وہ مریضوں کا علاج کرسکیں، یہ دین اسلام ہی کی خصوصیت ہے کہ اس نے اپنے ماننے والوں کو پہلے دن سے علم کی طرف توجہ دی، جس کے نتیجہ میں مسلمانوں نے علم میں ترقی کی، اور مختلف علوم وفنون وجود میں آئے۔

تاریخ سے ناواقفیت کا نتیجہ

موجودہ دور میں تاریخ سے واقفیت نہ رکھنے والے طبقہ کی سوچ یہ ہے کہ یورپ کو یہ ترقیاں شروع سے حاصل رہی ہیں، جب کہ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے، ہر میدان میں تمام علوم کی کمان مسلمانوں کے ہاتھ میں تھی، اس لیے کہ ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے پہلی ہی وحی میں علم سے رشتہ مضبوط کرنے کا حکم دیا گیا تھا، یہی وجہ ہے کہ اس کے بعد بے شمار علوم وجود میں آئے، جن کا شاید اس سے پہلے دنیا نے تصور بھی نہ کیا ہو، امویوں اور عباسیوں کے زمانہ کی تاریخ کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آج سائنس، طب، جغرافیہ، ریاضیات، فلکیات وغیرہ نہ جانے کتنے علوم جن سے ساری دنیا فائدہ اٹھارہی ہے، ان میں مسلمانوں نے بنیادی طور پر ایسی معلومات فراہم کی تھیں، یا بالفاظ دیگر مسلمانوں نے ان کی ایسی بنیادیں رکھ دی تھیں کہ آج فلک بوس عمارتیں انہیں بنیادوں پر تعمیر ہورہی ہیں، اور دنیا کی آنکھیں ان سے خیرہ ہورہی ہیں، لیکن دنیا اس حقیقت سے واقف نہیں کہ یہ عمارتیں کن بنیادوں پر تعمیر کی جارہی ہیں، جب کہ خود مغربی مفکرین نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ اگر مسلمانوں نے علوم میں ترقی نہ کی ہوتی، ہمیں یہ بنیادیں نہ دی ہوتیں، تو ہم کم از کم تین سو سال پیچھے ہوتے، اس اعتراف کی روشنی میں اگر آج سے تین سو سال پہلے کی حالت کا جائزہ لیا جائے، تو اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ آج کے مقابلہ میں پچھلی صدیوں میں نہیں بلکہ چند سال قبل تک دنیا ترقی کی راہوں سے کس قدر دور تھی، آج ہر جیب میں موبائل نظر آتا ہے، پچیس یا پچاس سال پہلے کی بات ہے کہ کسی شخص کے خیال میں بھی یہ بات نہ تھی کہ اس کی جیب میں موبائل ہوگا، اسی طرح اس سے بھی پہلے کا زمانہ دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس وقت دنیا مزید پیچھے تھی، بسا اوقات ایسا بھی ہوا کہ علوم میں ترقی نہ ہونے کی وجہ سے بہت سے ان لوگوں کو بعض قرآنی آیات میں اشکال پیدا ہوا، جو ہر چیز کے سمجھنے میں عقل کو مقدم رکھتے ہیں، مشہور ہے کہ سرسید احمد خاں مرحوم کو اس سلسلہ میں ایک بہت بڑی غلط فہمی ہوئی کہ قرآن مجید میں حضرت سلیمان علیہ السلام کے بارے میں فرمایا گیا:

”وَلِسُلَيْمَانَ الرِّيحَ غُدُوُّهَا شَهْرٌ وَرَوَاحُهَا شَهْرٌ“ [سبا:۱۲] (اور (ہم نے) سلیمان کے لیے ہوا (کو مسخر کیا) اس کا صبح کا سفر بھی ایک مہینہ (کی مسافت) کا ہوتا تھا اور شام کا سفر بھی ایک مہینہ (کی مسافت) کا)۔

یعنی حضرت سلیمان علیہ السلام مہینہ کی مسافت گھنٹوں میں طے کرلیتے تھے، سرسید احمد خاں مرحوم کو یہ بات سمجھ میں نہ آئی، لہٰذا اس کا انکار کر بیٹھے، لیکن جب اس کے بعد جہاز ایجاد ہوا، تو لوگوں نے یہ بات کہی کہ کاش آج سرسید مرحوم زندہ ہوتے اور لمبی مسافت کو کم وقت میں طے کرنے کی یہ عملی شکل ان کے سامنے آجاتی تو شاید وہ اس کا انکار نہ کرتے۔

منحوس ترین دن

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے لکھا ہے کہ جس وقت عیسائیوں کے ہاتھ میں علم کی کمان گئی شاید وہ دن دنیا کے لیے منحوس ترین دن تھا، جس کی وجہ یہ ہے کہ عیسائی علم کے دشمن تھے، اوپر بیان کیا جاچکا ہے کہ ان کے یہاں حصول علم کی مذہبی طور پر سخت ممانعت تھی، یہ آخری درجہ کی بات ہے کہ جب ان میں کسی شخص کے متعلق یہ معلوم ہوتا کہ وہ علم حاصل کررہا ہے تو اس کو زندہ جلادیا جاتا، اس سے بڑھ کر یہ کہ اگر کسی مرے ہوئے شخص کے بارے میں معلوم ہوتا کہ اس نے تعلیم حاصل کی تھی، تو اس کی قبر سے ہڈیاں نکال کر جلائی جاتیں، تاکہ تمام لوگوں کو عبرت حاصل ہو، لیکن چونکہ عیسائیوں کو صلیبی جنگوں میں مسلمانوں سے مستقل شکست کا سامنا کرنا پڑا، اس لیے ان کے بادشاہ لوئس نہم نے مصر کے قید خانہ میں اپنی قوم کو یہ وصیت لکھی کہ اگر مسلمانوں سے مقابلہ کرنا ہے تو اس کا صرف ایک راستہ ہے اور وہ یہ ہے کہ علم کے میدان میں ترقی کی جائے،

اور اس کی کمان اپنے ہاتھ میں لی جائے، چنانچہ ساتویں صدی ہجری میں اس وصیت کو مدنظر رکھتے ہوئے ان کے بعض مفکرین نے اپنے مذہبی پیشواؤں سے حصول علم کی اجازت لی، جن میں ریمن لل (Raman Lul) اور روجر بیکن (Roger Bacon) (۱۲۹۴-۱۲۱۴ء) خاص طور پر قابل ذکر ہیں، اجازت لینے کے بعد حصول علم کے لیے اندلس گئے، اور پھر جو کچھ انہوں نے سیکھا وہ لے کر آئے اور اپنی قوم میں انہوں نے اس کو عام کرنے کی ہر ممکن کوشش کی، یہ بھی اللہ تعالیٰ کا نظام وقانون ہے کہ جو قوم محنت کرتی ہے، اس کو اس کا صلہ دیا جاتا ہے، عیسائیوں نے علم پر محنت کی اور مسلمانوں نے اس سے بے اعتنائی برتی، اس لیے رفتہ رفتہ علم کی کمان ان ہاتھوں میں پہنچ گئی جن کا تعلق صرف علم سے تھا، اخلاقیات سے نہیں، کیونکہ ان لوگوں نے علم کو اللہ کے نام ساتھ مربوط نہیں کیا تھا، اور یہ علمی ترقی مذہب دشمنی کے ساتھ مربوط تھی، حکومت وکلیسا کی طویل کشمکش اور بالآخر مذہب کی شکست کے بعد ترقی کا سلسلہ آگے بڑھا تھا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ علم تمام دنیا کے لیے راحت کا ذریعہ بننے کے بجائے انسانیت کے لیے نقصان کا سبب بن گیا، یہ الگ بات ہے کہ اس علمی ترقی کی بنیاد پر دنیا کو بہت سی راحت کی چیزیں بھی حاصل ہوئیں، لیکن اسی کے ساتھ علم کا غلط استعمال بھی ہوا، اس کی وجہ صرف یہی تھی کہ وہ اخلاق وانسانیت سے خالی تھے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایٹم بم ایجاد ہوئے، اور ان کا غلط استعمال کیا گیا، جاپان کے دو شہروں میں ایسے مہلک بم پھینکے گئے کہ کئی لاکھ لوگوں کی جان گئی، انسائیکلوپیڈیا آف برٹانیکا میں اس حادثہ کا مفروضہ بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ کئی کروڑ لوگوں کی جان بچانے کے لیے پانچ لاکھ لوگوں کی جان لی گئی، گویا اگر وہاں بم نہ گرایا جاتا تو ممکن تھا کہ بہت لوگ مرجاتے، لہٰذا ایک شک کی بنیاد پر کئی لاکھ لوگوں کی جان لینا مناسب معلوم ہوا۔ (العیاذ باللہ)

موجودہ نصاب و نظام تعلیم

افسوس کی بات یہ ہے کہ وہی نظام تعلیم جو ہر طرح کے اخلاق و انسانیت سے عاری ہے آج ساری دنیا میں رائج ہے، حالانکہ یہ سامراجی نظام کی یادگار ہے، برطانیہ اور فرانس کے سامراجی دور میں انہوں نے اپنے جس نظام اور نصاب تعلیم کو مشرقی ملکوں میں تھوپا تھا، آج افسوس کی بات یہ ہے کہ ظاہری طور پر سامراج ختم ہونے کے باوجود بھی اکثر ملکوں میں وہی نظام جاری ہے، ان ملکوں کو اس بات کی قطعاً کوئی فکر نہیں کہ وہ خود اپنا نصاب تعلیم تیار کریں، اپنی آزادی کا ثبوت دیں، ہمارے ملک ہندوستان کی بھی بعینہٖ یہی صورت حال ہے، یہاں کے باشندوں کو اب تک یہ ہوش نہیں کہ وہ اس ملک کی تہذیب، یہاں کے قد وقامت کے لحاظ سے ایک نصاب تعلیم تیار کریں، ایسا نظام تعلیم ترتیب دیں جو اس ملک کے لیے مناسب حال ہو، جس میں انسانیت واخلاق کی قدریں ہوں، اور اس نظام میں ڈھلنے والا ایک اچھا انسان بن سکے، اس سے بڑھ کر افسوس ان مسلمان ملکوں پر ہے، جہاں اس سلسلہ کی کوئی کوشش نہیں کی گئی، جب کہ اس کی ضرورت نہ جانے کب سے محسوس ہورہی ہے، مفکر اسلام حضرت مولانا علی میاں ندویؒ نے نہایت پر زور طریقہ پر اس ضرورت کو پورا کرنے کی دعوت دی، جگہ جگہ یہ بات کہی کہ آج مسلمان ملکوں اور تمام مسلمانوں کے اوپر یہ ایک بہت بڑی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنا نظام ونصاب تعلیم تیار کریں، ایسا نصاب تعلیم جو ان کے عقائد واخلاق کے مناسب حال ہو، تاکہ کسی بھی طرح کی آپسی کشمکش پیدا نہ ہو، اس لیے کہ جب کشمکش پیدا ہوتی ہے تو اس کے نتیجہ میں صلاحیتیں ضائع ہوتی ہیں، عالم اسلام کے حکمراں طبقہ اور عوام میں کشمکش پیدا ہونے کا سب سے بڑا سبب نظام تعلیم کی خامیاں اور کمزوریاں ہی ہیں، جو آج تک ان ملکوں میں پائی جاتی ہیں، افسوس کی بات ہے کہ ہمارے اس ملک میں بھی وہی خامیاں موجود ہیں، ضرورت اس بات کی تھی کہ موجودہ نصاب تعلیم میں بعض ایسی تبدیلیاں کی جاتیں، جو اس ملک کے لیے مفید ہوتیں، مگر طرفہ تماشہ یہ کہ آج یہاں کے نصاب تعلیم میں ایسی تبدیلیاں کرنے کی کوششیں جاری ہیں، جو تبدیلیاں اس ملک کے لیے سخت خطرہ بن سکتی ہیں، اس کا ڈر ہے کہ اس کے نتیجہ میں یہاں کی آبادی کے اندر آپس میں ایک ایسی خلیج پیدا ہوجائے جس خلیج کو پاٹا نہ جاسکے، اور اس کی وجہ سے ملک کی ترقی کی تمام راہیں مسدود ہوجائیں، واقعہ یہ ہے کہ اس وقت جو نظام اور نصاب تعلیم مرتب کیا جارہا ہے، اس میں ایسی ہی چیزیں مزید داخل کی جارہی ہیں جس کے نتیجہ میں بڑا انتشار پیدا ہوسکتا ہے۔

مسلمانوں کی ذمہ داری

یہ ذمہ داری سب سے بڑھ کر مسلمانوں کی ہے کہ وہ ایسا نصاب تعلیم تیار کریں جو یہاں کی آبادی کے لحاظ سے موزوں ہو، خاص طور پر مسلمانوں کے عقائد اور نظام اخلاق وعبادات کے اعتبار سے مکمل ہو، ایک طرف اس کا پڑھنے والا زمانہ کے تقاضوں کو پورا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو، دوسری طرف وہ پورا مسلمان بھی ہو، یعنی عقائد مضبوط ہوں، اخلاقیات

سے واقف ہو، اس کے بعد خواہ وہ انجینئر بنے یا ڈاکٹر، یا اس کے علاوہ کسی بھی شعبہ زندگی کو اختیار کرے، اس کا طرۂ امتیاز یہی ہو کہ وہ سب سے پہلے ایک پختہ مسلمان ہو، اس کے ساتھ ساتھ اس کے اندر وہ تمام صلاحیتیں بھی موجود ہوں جو اعلیٰ سے اعلیٰ اسکول میں تعلیم پانے والے کے اندر ہوسکتی ہیں، تاکہ علم اور اسم الٰہی کے مضبوط تعلق کے اس خلا کو پر کیا جاسکے جو صدیوں سے چلا آرہا ہے، لیکن آج مسلمانوں کا المیہ یہ ہے کہ ہمارے بچے ہندوؤں یا عیسائیوں کے اسکولوں اور کالجوں میں جاتے ہیں، جہاں ان کے عقیدہ کو کھوکھلا کیا جاتا ہے، دیو مالائی نظام پڑھایا جاتا ہے، اسی لیے موجودہ حالات میں مسئلہ صرف عمل کا نہیں رہ گیا، بلکہ مسئلہ عقیدہ کا ہے، آج مسلمان بچوں کو عقیدہ کے اعتبار سے ایسی مہلک باتیں بتائی جارہی ہیں، اور عملی طور پر ایسی شکلیں اختیار کرائی جارہی ہیں، جن کے بعد ان کو مسلمان کہنا بھی مشکل ہے، ضرورت اس بات کی ہے کہ ان حالات میں اپنا نصاب تعلیم تیار کیا جائے ،اسلامک اسکول قائم کیے جائیں، چونکہ یہ کام دیر طلب ہے، لہٰذا ہر مسلمان کے لیے فوری طور پر ضروری ہے کہ وہ طے کرلے کہ ہمارے جو بچے اسکولوں یا کالجوں میں جارہے ہیں، ان کو دینیات کی تعلیم دلانا ہے، یعنی عقائد کی اصلاح کے لیے، قرآن مجید پڑھانے کے لیے، دینی تعلیم دینے کے لیے صباحی و مسائی مکاتب کا انتظام کرنا ہے، یہ ہمارے اوپر ایک ایسا فریضہ ہے کہ اگر خدانخواستہ ہم نے فوری طور پر اس کو ادا نہ کیا تو اس بات کا ڈر ہے کہ ہماری آنے والی نسل عقیدہ کے ارتداد کا شکار نہ ہوجائے، موجودہ حالات میں مسئلہ عملی یا فکری ارتداد کا نہیں بلکہ عقیدہ کے ارتداد کا ہے، آج عیسائی اسکولوں میں جانے والے مسلمان بچوں کے ذہن و دماغ میں یہ بات راسخ کرائی جارہی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام خدا کے بیٹے اور خدائی میں شریک تھے، ہندو اسکولوں میں جانے والے بچوں کو دیو مالائی نظام پڑھایا جارہا ہے، اسی نہج پر ان کی تربیت بھی کی جارہی ہے، لیکن افسوس کی بات ہے کہ ہم ان تمام باتوں سے بالکل بے خبر ہیں۔

غفلت کا نتیجہ

ایک صاحب جو بڑے دین دار ہیں، انہوں نے بیان کیا کہ ہماری بچی اسکول میں جاتی تھی، ایک مرتبہ اسکول لے جانے کے لیے رکشہ نہیں آیا، ہم اپنی گاڑی سے اس کو اسکول چھوڑنے گئے، راستہ میں ایک مندر گذرا، جس کو دیکھ کر اچانک ہماری بچی اپنے ہاتھ جوڑ کر کھڑی ہوگئی، ہم نے معلوم کیا: تم یہ کیا کررہی ہو؟ اس نے جواب دیا: ہماری استانی نے بتایا تھا کہ یہ جگہیں بڑی مقدس ہوتی ہیں، اگر راستہ میں کوئی مسجد، مندر یا کلیسا آجائے تو فوراً ہاتھ جوڑ لینا چاہئیں، اس کے ذریعہ خدا کی مدد ہوتی ہے، اور وہ راضی ہوتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس طرح کے واقعات ایک دو نہیں بلکہ دسیوں ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ہماری غفلت کے سبب ہمارے بچے اسلامی عقائد سے دور ہوتے جارہے ہیں۔

فکر کی ضرورت

اگر ہم نے ایسے خطرناک حالات میں اپنی آئندہ نسل کے عقیدہ کی حفاظت کی فکر نہ کی، اس کے لیے کوششیں نہ کیں، تو ڈر ہے کہ خدانخواستہ آخرت میں اس بات پر ہماری گرفت نہ ہو کہ ہم نے اپنے بچوں کو ایسے اسکولوں میں کیوں بھیجا، جہاں صحیح دینی تعلیم کا نظم نہ تھا، اللہ تعالیٰ نے سب سے بڑھ کر مسلمانوں کو یہ ذمہ داری دی ہے کہ وہ علم کا رشتہ خالق سے مربوط کرکے علم میں ترقی کریں، اسلام کے اخلاقی نظام کو بھی قائم رکھیں، تمام دنیا کو اس علم کے ذریعہ فائدہ پہنچائیں، امت مسلمہ کو آخری وحی کے ذریعہ سب سے پہلے یہی پیغام دیا گیا ہے، اس لیے اس امت کا فرض منصبی یہ ہے کہ یہ امت علم کو اپنے ہاتھ میں رکھے، اس کی اصلاح کرے، اور اس کو صحیح رخ دے، اسی کے ساتھ علم کو اخلاقی نظام سے ایسا مربوط کردے کہ دین و دنیا دونوں میں توازن قائم رہے، یہ کام اس امت کے لیے نہایت آسان ہے، اس لیے کہ اس کے پاس عقیدۂ توحید ہے، اللہ کی خشیت ہے، حضور پاک علیہ الصلاۃ والسلام کی شریعت ہے، صحابہ کرامؓ کے نظام اخلاق کا وہ نمونہ ہے جس سے بڑھ کر دنیائے انسانیت نے نہ دیکھا ہے، نہ دیکھ سکتی ہے، حقیقت یہ ہے کہ اگر ان تمام باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے امت مسلمہ علم کی کمان اپنے ہاتھ میں لیتی تو دوسرے مذاہب کے ماننے والے بھی ان کی خدمات ماننے پر مجبور ہوتے، اپنے بچوں کو ایسے اسکولوں میں پڑھانے پر فخر محسوس کرتے، جہاں علم کے ساتھ نظام اخلاق بھی عطا کیا جاتا ہو، والدین کے ساتھ حسن سلوک کی تعلیم دی جاتی ہو، پڑوسی کے حقوق کا پاس رکھنے کی تعلیم دی جاتی ہو، رشتہ داریوں کے نباہنے پر زور دیا جاتا ہو، انسانیت نوازی کی تعلیم سے آراستہ کیا جاتا ہو، موجودہ دور میں گرچہ عیسائی مشنریز کے اسکول بہت ترقی یافتہ سمجھے جاتے ہیں، مگر اس حقیقت کا ہر ایک کو اعتراف ہے کہ یہاں پڑھنے والے بچے انسان کو انسان نہیں سمجھتے، ماں باپ کو گولیاں مارنے پر تیار رہتے ہیں، پڑوسی کا کوئی حق نہیں سمجھتے، گویا وہاں سے فراغت کے بعد وہ کسی درندہ یا جانور کی شکل

اختیار کر لیتے ہیں، جس کو کسی بھی انسان پر ترس نہیں آتا، خواہ وہ اس کے والدین یا اعزاء اقرباء ہی کیوں نہ ہوں، چند منافع کے حصول کے لیے وہ ہر ایک کو دھوکہ دینا جائز سمجھتے ہیں، اس لیے کہ ان کو صرف خود غرضی ہی کی تعلیم دی جاتی ہے، یہی وجہ ہے کہ آج ایسی فحش باتیں سامنے آرہی ہیں جن کا تذکرہ بھی مناسب نہیں۔

موجودہ دور کی تعلیم

موجودہ دور کی تعلیم کی خصوصیت یہ ہے کہ اس نے جہالت کے بہت سے کاموں کو فن بنا دیا ہے، جس سے جاہلیت والا کام علم کی آڑ میں بآسانی کیا جاسکتا ہے، برادر مخدوم و معظم مولانا سید عبداللہ حسنی ندویؒ فرماتے تھے کہ آج جہالت پڑھ لکھ گئی ہے، ایک زمانہ وہ تھا کہ چور کھلے عام جیب کاٹتا تھا، لیکن آج کا زمانہ ایسا ہے کہ انسان سر عام چوری نہیں کرتا بلکہ ڈاکٹر بن کر لوگوں کی کڈنیوں، گردوں اور جسم کے اعضاء چوری کرتا ہے اور اس سے اپنا بیلنس بڑھاتا ہے، کیونکہ پڑھنے کے زمانہ میں لاکھوں، کروروں روپئے دے کر علم حاصل کیا تھا، گویا حصول علم کی راہ میں اپنی جیب کٹائی تھی، لہٰذا جب علم حاصل کر لیا تو پڑھ لکھ کر انسانیت کی خدمت کے بجائے ان کی جیب کاٹنا شروع کر دی تاکہ تلافی مافات کی جاسکے، اس قسم کی چوری کے واقعات اخبارات میں چھپنا عام بات ہے، یہاں یہ بھی واضح رہے کہ سماج میں صرف اسی ذہنیت کے ڈاکٹر نہیں، بلکہ ایسے ڈاکٹر بھی موجود ہیں جن کے اندر محبت کی کسک ہے، انسانیت کا درد ہے، مگر افسوس کی بات یہ ہے کہ اس کے ساتھ ساتھ ہمارے معاشرہ میں بعض ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو درندہ صفت نظر آتے ہیں، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے اپنی ایک تقریر میں اسی افسوس کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا:

”آج کے نظام تعلیم نے یہ نہیں سکھایا کہ خدا کیا ہے؟ اس نے تو یہ سکھایا ہے کہ جہاں اپنی عزت کا سوال ہو، جہاں تم کو ذاتی نفع ہو رہا ہو، وہاں اس نفع کو حاصل کرنے کے لیے اپنے وطن اور اپنی عزت کو نیلام کر دو، اسی وجہ سے آج انسان انسان کا سودا کر رہا ہے، آج انسان بک رہا ہے، پارٹیاں بک رہی ہیں، تیس چالیس برس کی وفاداریاں بک رہی ہیں، آج ہماری پارلیمنٹ اور اسمبلیاں نخاس کی طرح ہوگئی ہیں، جہاں خلیج بنگال سے لے کر پنجاب تک لوگ بھیڑ بکریوں اور خربوزوں کی طرح بک رہے ہیں، یہ سب اسی نظام تعلیم کا لازمی نتیجہ ہے“۔
[تکبیر مسلسل، ص:۳۱۳-۳۱۴]

وقت کی اہم ضرورت

علم کا صحیح استعمال نہ ہونے کے سبب ملک کی بگڑتی صورت حال ہمارے سامنے ہے، ہر شخص اس بات کو بخوبی سمجھ رہا ہے کہ آہستہ آہستہ اس ملک میں بھی یورپین کلچر Develop ہو رہا ہے، جس کے اندر انسانیت فروشی کے سوا کچھ نہیں، لہٰذا ان حالات میں مسلمانوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنا نصاب و نظام تعلیم ترتیب دینے کی طرف توجہ دیں، اللہ کا شکر ہے کہ بعض فکر مند افراد اس سلسلہ میں کوشش کر رہے ہیں، اور اس کے اچھے نتائج بھی سامنے آرہے ہیں، مگر ابھی اس کی ضرورت ہے کہ اس سے کہیں بڑے پیمانہ پر یہ کوششیں کی جائیں کہ علم کو دو خانوں میں تقسیم نہ کیا جائے، علم کو ایک اکائی سمجھا جائے، اور انسانیت کے لیے درپیش خطرات کو دور کیا جائے، علم کو انسانیت کے حق میں مفید بنانے کی کوشش کی جائے۔

☆☆☆☆☆

مکتوبات

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ (جلد ششم)

مرتب: مولانا سید محمد حمزہ حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ

مکمل صفحات: ۴۴۰ قیمت: ۳۵۰/روپے

مجلس تحقیقات ونشریات اسلام

ٹیگور مارگ، ندوہ کیمپس، ندوۃ العلماء، لکھنؤ

فون نمبر: 0522-2741539 موبائل نمبر: 9889378176

ای میل: info@airp.org.in

محاسن اسلام

اسلام میں یتیموں کی پرورش ونگہداشت کا تصور

مولانا محمد طارق نعمان

یتیم بچے بھی معاشرہ کا ایسے ہی حصہ ہیں جیسے عام بچے، انہیں بھی دنیا میں جینے، تعلیم حاصل کرنے اور معاشرہ میں نمایاں مقام حاصل کرنے کا اتنا ہی حق ہے جتنا کہ دیگر بچوں کا حق ہے، لیکن نہ ان کے قریبی رشتہ دار اس جانب توجہ کرتے ہیں نہ حقوق انسانی کی پاسداری کا دم بھرنے والے نام نہاد اور سماجی کارکن، اگر چہ یہ لوگ وقتی طور پر ان سے ہمدردی جتاتے ہیں اور ان کے لیے تسلی کے کلمات دہراتے ہیں مگر کوئی ان کی مکمل دیکھ ریکھ، کفالت اور تعلیم وتربیت کی ذمہ داری لینا نہیں چاہتا، لوگ اس کو اپنے اوپر بوجھ سمجھ کر اس سے کتراتے ہیں۔

اگر ہم اسلامی تعلیمات کو دیکھیں جس کی بنیاد ایثار، قربانی، شفقت ومحبت اور حقوق کی پاسداری پر ہے تو معلوم ہوگا کہ اسلام انسانوں کو حرص وہوس، بخل اور مال کا لالچ جیسی بیماریوں سے نکال کر ان میں انفاق کا جذبہ پیدا کرتا ہے اور یتیم و نادار اور لاوارث بچوں کی کفالت پر ابھارتا ہے، اس نے اس ذمہ داری کی انجام دہی اور اس معاشرتی حق کی ادائیگی کے لیے کئی راستے نکالے ہیں اور ناحق طریقہ سے یتیموں کا مال ہڑپ کر لینے والوں کو سخت تنبیہ کی ہے، تاکہ ان بے سہارا بچوں کو سہارا مل سکے اور ان کا مال ضائع نہ ہو، یتیموں کی کفالت اور ان کے ساتھ ہمدردی کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ قرآن کریم میں کئی مقامات پر یتیموں کا تذکرہ کیا گیا ہے اور ان کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیا گیا ہے، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے جس ترجمہ ہے کہ: ”پوچھتے ہیں: یتیموں کے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے؟ کہو! جس طرز عمل میں ان کے لیے بھلائی ہو، وہی اختیار کرنا بہتر ہے، اگر تم اپنا اور ان کا خرچ اور رہنا سہنا مشترک رکھو، تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں، آخر وہ تمہارے بھائی بند ہی تو ہیں، برائی کرنے والے اور بھلائی کرنے والے، دونوں کا حال اللہ پر روشن ہے، اللہ چاہتا تو اس معاملے میں تم پر سختی کرتا، مگر وہ صاحبِ اختیار ہونے کے ساتھ صاحبِ حکمت بھی ہے۔[سورۃ البقرۃ ۲۲۰]

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے فرمودات کے ذریعہ بھی اور اپنے عمل سے بھی واضح کر دیا ہے کہ یتیم معاشرے میں اپنا ایک مقام ومرتبہ رکھتے ہیں ان کا خیال رکھنا معاشرے کے ہر فرد کی ذمہ داری ہے، دل کی قساوت اگر کسی چیز سے دور ہوتی ہے تو یتیموں کے سر پہ دست شفقت رکھنے سے ہوتی ہے، چنانچہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دل کی سختی وقساوت کی شکایت کی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے حکم دیا کہ یتیم کے سر پر شفقت ومحبت کا ہاتھ پھیرے، غریبوں ونادار وں کو کھانا کھلائے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ہرگز نہیں بلکہ تم لوگ نہ تو یتیم کے ساتھ عزت کا سلوک کرتے ہو، اور نہ ہی مسکین کو کھانا کھلانے کے ترغیب دیتے ہو۔[سورۃ الفجر: ۱۷، ۱۸]

بہترین اور بدترین گھر

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے عمدہ وبہتر اور نہایت بابرکت گھر اسے قرار دیا ہے جس گھر کے اندر کوئی یتیم ہو اور اس کے ساتھ نہایت اچھا برتاؤ کیا جاتا ہو۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مسلمانوں میں سب سے اچھا گھر وہ ہے جس میں کوئی یتیم ہو اور اس کے ساتھ نیک سلوک کیا جاتا ہو اور سب سے بدترین گھر وہ ہے جس میں کوئی یتیم ہو اور اس کے ساتھ برا سلوک کیا جاتا ہو۔ [ابن ماجہ، سنن ابی داؤد]

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا کہ نہایت بدتر وبد بخت انسان وہ ہے جو یتیموں کے ساتھ برا سلوک کرے اور اس کے ساتھ نامناسب اور دل توڑنے والا برتاؤ کرے، اللہ کے نبی کی یہ اور اس طرح کی تعلیمات اسی لیے ہیں کہ یتیموں کے اولیاء ان کی کفالت کرنے والے اور مصیبت زدہ یتیموں پر مشتمل خاندان والے بد دل وشکستہ خاطر نہ ہوں اور ان کے وجود سے الجھن وپریشانی محسوس نہ کریں بلکہ لوگ اسے آپس میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کا ذریعہ بنائیں اور بڑھ چڑھ کر ان کی مدد کریں، سہارا بننے اور خبر گیری کرنے میں لوگ آگے بڑھنے کی کوشش کریں۔

یتیم کی کفالت، جنت کی ضمانت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یتیموں سے متعلق تعلیمات سے ہمیں بہرہ ور کر کے یہ بتایا ہے کہ یتیم سماج میں خیر وبرکت اور سعادت وخوش بختی کا ذریعہ ہیں، وہ بوجھ نہیں، یہی نہیں بلکہ اللہ کے نبی نے یتیموں کی کفالت کرنے والوں کو یہ خوشخبری بھی دی ہے کہ وہ جنت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اور بالکل قریب ہوں گے۔

حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میں اور یتیم کی کفالت کرنے والا شخص جنت میں اِس طرح ہوں گے۔ اور (آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے) اپنی شہادت کی انگلی اور درمیانی انگلی سے اشارہ کیا اور دونوں کے درمیان کچھ فاصلہ رکھا''۔[بخاری شریف]

حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے یتیم کے سر پر ہاتھ پھیرا اور اس کا مقصد صرف اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرنا تھا تو اس کے لیے ہر اس بال کے بدلے نیکیاں ہیں جس جس بال کو اس کا ہاتھ لگا تھا، جس نے اپنی زیر کفالت کسی یتیم بچی یا بچے کے ساتھ اچھا سلوک کیا تو وہ اور میں جنت میں اِس طرح ہوں گے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی شہادت کی انگلی اور درمیانی انگلی میں تھوڑا سا فاصلہ رکھا۔[مسند احمد بن حنبل]

تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم یتیموں کے ساتھ بے پناہ ہمدردی کرتے تھے، شفقت ومحبت کا برتاؤ کرتے تھے، ان کی خبر گیری کرتے تھے اور ان کے ساتھ حسن سلوک کرنے کی تاکید وتلقین کرتے رہتے تھے، سماج کے پچھڑے ہوئے طبقے اور کمزور لوگ بطور خاص نبی کریم کے پاس یتیموں کو لے کر آتے تھے تاکہ انہیں دیکھ کر رسول اللہ ان کے لیے بھی دعا کریں اور ان کے ساتھ ہمدردی کا سلوک کریں، لوگ جانتے تھے کہ رسول اللہ یتیموں کو کتنا چاہتے ہیں اور ان سے کس قدر ہمدردی رکھتے ہیں تو گویا لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہمدردی حاصل کرنے اور انس ومحبت پانے کے لیے یتیموں کا سہارا لیتے تھے۔

یتیم کون ہے؟

یتیم وہی ہوتا ہے جو اپنی طفولت وبچپن میں اپنے والدین میں سے کسی ایک کو کھو چکا ہو، اس کا بچپن اسے کھیل کود، الفت ومحبت اور پیار ولگاؤ کے لیے مجبور کرتا ہے، وہ چاہتا ہے کہ اس کا کوئی ہمدرد ہو جو اس کے ساتھ پیار بھرا سلوک کرے، اس کی دلجوئی کرے، ماں باپ اس کی اس خواہش اور فطری داعیے کو پورا کرتے ہیں، مگر باپ جو اس کا سہارا تھا، اس کی کفالت کرتا اس کی دلجوئی کرتا اور اس کے لاڈ پیار کو سہتا اور اس کی خواہش پوری کرنے میں اپنی بساط کے مطابق کوشش کرتا تھا۔

اب جبکہ اس کے سر سے اس کا سایہ اٹھ چکا ہے، وہ اس پیار ومحبت اور شفقت ورحمت کے لیے ترستا رہتا ہے اور جب کوئی شخص اسے باپ سا پیار دیتا ہے، باپ کی طرح لطف وکرم کا معاملہ کرتا ہے، محبت بھری نگاہ اس پر ڈالتا ہے اور بڑے پیار وشفقت سے اس کے سر پر ہاتھ رکھتا ہے تو بچہ اس سے مانوس ہو جاتا ہے اور باپ کے کھونے کا غم ہلکا ہو جاتا ہے، وہ محسوس کرتا ہے کہ اس کے باپ کے رخصت ہو جانے کے بعد بھی اسے پوچھنے والا کوئی ہے جو اس کے ساتھ ہمدردی ودلجوئی کر سکتا ہے، اس کے غم کو ہلکا کر سکتا ہے، اس کے درد کو محسوس کر سکتا ہے اور اس کے خواہشات وجذبات کو سمجھ سکتا ہے، باپ کے ساتھ وہ کھیلتا کودتا، گھومتا، پھرتا، تفریح کرتا اور لاڈ وپیار کرتا تھا، من چاہی چیزیں طلب کرتا اور نہ ملنے پر ضد کرتا تھا اور باپ اسکے سارے لاڈ وپیار کو شوق وجذبے کیساتھ سہتا تھا، مگر اچانک باپ کے وفات پا جانے کے بعد اس کی زندگی تبدیل ہو جاتی ہے، وہ آسمان کی بلندیوں پر پرواز کر رہا تھا، اور اچانک زمین پر گر جاتا ہے، وہ اپنے سامنے دنیا کو تاریک پاتا ہے، وہ دوسرے بچوں کو جب اپنے ماں باپ کے ساتھ اٹکھیلیاں کرتے دیکھتا ہے تو اس کا دل تڑپ اٹھتا ہے، اسے اپنا ماضی یاد آنے لگتا ہے اور پرانی باتیں اسے ستانے لگتی ہیں، مگر اس حال میں جب کوئی اسے غمگسار مل جاتا ہے جو باپ جیسی محبت تو نہیں دے سکتا مگر اس کا متبادل بن سکتا ہے تو اسی کو وہ بچہ اپنے لیے بڑا سہارا سمجھتا ہے، اسی لیے اسلام نے یتیموں کی خبر گیری وہمدردی پر بڑی توجہ دلائی ہے اور اس کے لیے مختلف انداز وپیرہن میں ابھارا ہے جو یتیموں کی کفالت کرتے ہیں، ان کے لیے بھرپور اجر وثواب کا وعدہ کیا ہے اور ان کے ساتھ بہتر سلوک کرنے پر جنت کا وعدہ کیا ہے۔

یتیموں کے آنسوئوں کو پونچھیں

اسلامی معاشرے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر مسلمان کو یتیم کے لیے مشفق باپ قرار دیا ہے، اسلام نے ان ہدایات کے ذریعہ خیر کے دائرے کو وسیع کر دیا ہے تاکہ ہر امیر وغریب اس میدان میں داخل ہو کر زیادہ سے زیادہ بھلائی کے عمل سے مستفید ہو سکے، اسلام نے ہر مفید ونافع عمل کو صدقہ قرار دیا ہے اس پر اجر وثواب رکھے ہیں، اس طرح مالدار انفاق کے ذریعہ اجر حاصل کرتا ہے اور جو مالدار نہیں وہ بھلی باتوں، میٹھی گفتگو اور ہمدردی کے جذبات کا اظہار کر کے اجر حاصل کرتا ہے، اللہ کے نبی نے ہر بھلی بات اور نیک کام کو صدقہ قرار دیا ہے، اس طرح اسلام نے سماج کی تعمیر اس کی خدمات اور اس کو بہتر بنانے میں ہر ایک کو شریک ہونے کا موقع فراہم کیا ہے، اس وقت جبکہ مسلمان رمضان کی خیر وبرکت سے مستفید ہونے والے ہیں انہیں چاہیے کہ اس کی برکات سے زیادہ سے زیادہ مستفید ہونے کی کوشش کریں، عمل خیر میں حصہ لیں، اور تعاون ودستگیری میں بڑھ چڑھ کر ہاتھ بٹائیں، یتیموں کے آنسوؤں کو پونچھیں، ان کے سر پر دست شفقت رکھ کر ان کے غم کو ہلکا کریں۔

ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ سخاوت والا ہاتھ جو اللہ کے دیے ہوئے مال ہی میں سے اللہ کے راستہ میں

خرچ کرتا ہے، ان کا یہ عمل اس میٹھے پانی کی طرح ہے جو مردار زمین کو سیراب کرنے کے بعد اسے نئی زندگی عطا کرتا ہے، پھر وہ زمین لہلہا اٹھتی ہے اور بیل بوٹے اور پودے و درخت اگا کر انسانوں اور جانوروں کو اپنے ثمرات سے مستفید کرتی ہے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم سب کھلے دل سے یتیم و بے سہارا افراد کے لیے اپنا دست تعاون دراز کریں، ہمدردی کے جذبات سے سرشار ہو کر یتیموں، بیکسوں کا سہارا بنیں اور سال میں صرف ایک دن نہیں بلکہ ہر روز اور ہر لمحہ انہیں یاد رکھیں اور ان کی تعلیمی، معاشی اور ہر میدان میں بہتری کی فکر کریں تا کہ ان یتیموں کو اپنے شفیق باپ کی عدم موجودگی کا احساس نہ ستائے، اور وہ اپنے مسلم معاشرے میں خود کو تنہا و بے سہارا محسوس نہ کریں، موجودہ دور میں مادہ پرستی کے غلبے نے یتیموں کی پرورش کو نہ صرف مشکل بنا دیا ہے بلکہ اب اس کے بارے میں لوگ سوچنا بھی نہیں چاہتے، اس طرح یتیم اور نادار بچوں کی زندگیاں بے سرپرست تباہ ہو جاتی ہیں، پھر وہی بچے معاشرے کے لیے ناسور بن جاتے ہیں، مذکورہ بالا ارشادات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے اگر کوئی شخص یتیم کی کفالت کرے اور اس کی بہترین پرورش کرے تو وہ یقیناً جنت کا مستحق ہوگا جہاں اسے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی رفاقت نصیب ہوگی اور یہ بچے اچھی پرورش کے نتیجے میں معاشرہ میں نمایاں مقام حاصل کریں گے، جس سے معاشرہ پرامن اور خوشحال ہوگا۔

اللہ تعالیٰ ہمیں یتیموں کی کفالت کے لیے قبول فرمائے اور ان کا دست و بازو بنائے۔

☆☆☆☆☆

موجودہ ذرائع ابلاغ اور اس کے اثرات

مولانا سید جعفر مسعود حسنی ندوی

ذہن کو تھوڑا سا یکسو کیجیے، عقل کو شریعت کے تابع بنائیے، پھر سورۃ الحجرات کی آیت/۶ میں دی گئی ہدایت کو سمجھنے کی کوشش کیجیے، لفظ ''فاسق'' کو لیجیے، فسق سے بنا ہے، ف، س، ق، اس کا مادہ ہے، معنی ہیں نافرمانی کے، بدکرداری کے، غلط بیانی کے، بے حیائی کے، ضروری نہیں کہ یہ سارے اوصاف بیک وقت کسی ایک شخص میں جمع ہو جائیں، ان میں سے کوئی ایک صفت بھی اگر کسی میں پائی جائے گی تو اس کو فاسق کہا جا سکتا ہے، جیسے منافق کی تین علامتیں بیان کی گئی ہیں، بولتا ہے تو جھوٹ بولتا ہے، وعدہ کرتا ہے تو وعدہ خلافی کرتا ہے، امانت رکھائی جاتی ہے تو خیانت کرتا ہے، بعض روایات میں ایک علامت یہ بھی بتائی گئی ہے کہ جب جھگڑا کرتا ہے تو بدکلامی پر اتر آتا ہے، اب کسی میں ان چاروں علامتوں میں سے کوئی ایک بھی علامت پائی جائے گی تو اس پر جزوی نفاق کا اطلاق ہوگا اور اگر خدانخواستہ یہ چاروں علامتیں اس میں نظر آئیں گی تو پھر وہ پورے کا پورا منافق ہوگا۔

اب آیئے آج کے ذرائع ابلاغ پر! کیا آپ کو اس بات پر اعتراض ہو سکتا ہے کہ موجودہ ذرائع ابلاغ کو فاسق قرار دیا جائے اور اس کے ساتھ وہ معاملہ کیا جائے جو فاسق کے ساتھ اس آیت میں کرنے کا حکم دیا گیا ہے؟ یعنی تحقیق کے بغیر یقین نہ کرنا، کیوں کہ اگر ان خبروں پر بغیر تحقیق کے یقین کر لیا گیا تو پھر وہی نتیجہ نکلے گا جس نتیجہ سے یہ آیت ہمیں آگاہ کر رہی ہے، یعنی اپنی نادانی سے ہم کچھ لوگوں کو نقصان پہونچا بیٹھیں گے، اور پھر بعد میں پچھتائیں گے۔

آج دنیا میں جو بگاڑ ہے، فساد ہے، لوٹ مار ہے، دہشت گردی اور تشدد پسندی ہے، کشیدگی اور فرقہ واریت ہے، خوں ریزی و خوں آشامی ہے، بدگمانی و بے اعتمادی ہے، تہمت و الزام تراشی ہے، سچ کو جھوٹ قرار دینا اور جھوٹ کو سچ ثابت کرنا ہے، اجالے کو اندھیرا اور اندھیرے کو اجالا بتانا ہے، صحیح کو غلط اور غلط کو صحیح قرار دینا ہے، یہ سب اسی فاسقانہ صفات کے حامل میڈیا پر آنکھیں بند کر کے یقین کرنے کا نتیجہ ہے۔ خبر کہاں سے آ رہی ہے؟ کس نے دی ہے؟ کیسے پہونچی ہے؟ کن واسطوں سے پہونچی ہے؟ اور کیوں پہونچی ہے؟ یہ سب سمجھے بغیر بلکہ سمجھنے کی کوشش کیے بغیر رائے قائم کر لینا' نہ صرف یہ کہ جہالت اور نادانی ہے بلکہ ایک گناہ ہے جو ہم سب سے سرزد ہو رہا ہے، غیبت کا دروازہ اسی سے کھلتا ہے، بدگمانی کو راہ اسی سے ملتی ہے، غلط فیصلے کرنے کا سبب یہی چیز بنتی ہے، جو رائے ٹی وی کی نشریات پر قائم کی جاتی ہے، جو فیصلہ اخبارات میں شائع خبروں کی بنیاد پر کیا جاتا ہے، وہ اکثر غلط ثابت ہوتا ہے، اور اس کا نقصان صرف ہم کو اور آپ کو نہیں، پوری قوم کو برداشت کرنا پڑتا ہے۔ من گھڑت واقعات کی تشہیر میں اور اسٹوڈیو میں فلمائے گئے مناظر کی ترسیل میں، اخبارات وٹی وی سے زیادہ موبائل کا حصہ ہے، چھوٹی سی یہ ڈبیہ ذہن سازی کا وہ کام کر رہی ہے، جو پچاس پچاس انچ کے ٹی وی اور پچاس پچاس صفحات کے اخبارات نہیں کر پا رہے ہیں، ہماری نادانی یہ ہے کہ ہم نے سوچے سمجھے بغیر فلمائے گئے ان مناظر کو صحیح مان لیا۔

☆☆☆

فقہ وفتاویٰ

سوال وجواب

مفتی محمد ظفر عالم ندوی

سوال: کیا بینک سے حاصل شدہ سودی رقم بحالت مجبوری کسی کو رشوت میں دی جاسکتی ہے، اگر رشوت نہ دی جائے تو کام ہونا مشکل ہوجائے اور نقصان کا اندیشہ رہتا ہے، اس صورت میں کیا کرنا چاہیے؟

جواب: رشوت دینا خود حرام ہے اور رشوت کے ساتھ اس میں سود کی رقم دینا دہرا گناہ ہے، اس لیے یہ صورت جائز نہیں ہے، ہاں اگر کوئی ناحق ظلم سے بچنے کے لیے رشوت دینے پر مجبور ہوجائے تو اس صورت میں اس کی گنجائش ہوسکتی ہے لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ کسی مقامی دارالافتاء کے مفتی کے سامنے سارے احوال رکھ کر ان سے رائے لی جائے وہ جو رائے دیں اس پر عمل کیا جائے۔

سوال: سود کی رقم یتیم لڑکی کی شادی میں دے کر یا بیمار شخص کی مدد کر کے ثواب حاصل کیا جاسکتا ہے؟

جواب: سود کی رقم ثواب کی نیت سے دینا گناہ ہے کیونکہ مال حرام سے صدقہ کرنا صدقہ کی توہین ہے، البتہ بلانیت صدقہ یتیم لڑکی کی شادی یا بیمار شخص کے علاج کے لیے سود کی رقم دی جاسکتی ہے بشرطیکہ وہ اس کے محتاج ہوں اور شادی اور علاج کے لیے ان کے پاس جائز رقم موجود نہ ہو۔

[ردالمحتار: ج۷/ص۲۲۳]

سوال: کیا حاصل شدہ سود کی رقم کسی ضرورت مند یا غریب کو بطور قرض حسنہ دے کر واپس شدہ رقم اپنے مصرف میں لاسکتے ہیں؟

جواب: سود کی رقم قرض میں دینا، پھر قرض سے واپسی کے بعد اسے اپنے مصرف میں لانا جائز نہیں، اگر سود کی رقم کسی مسلمان کے پاس آجائے تو اسے چاہیے کہ بلانیت صدقہ وثواب غربا پر خرچ کردے۔

[بذل المجہود: ج۱/ص۳۷]

سوال: بکر نے زید سے قرض لیا لیکن تقریباً ۱۰۰ سال سے زید کا علم نہیں اور بکر قرض ادا کرنا چاہتا ہے تو کس طرح ادا کرے، کیا ان کے ورثاء کو قرض ادا کرنے سے ادائیگی ہوجائے گی؟

جواب: اگر بکر نے زید سے قرض لیا ہو اور زید کا علم نہ ہو اور نہ اس کے ملنے کی امید ہو، البتہ ان کے ورثاء کا پتہ ہو تو اس صورت میں زید سے لیا گیا قرض ان کے ورثاء کو دیا جائے گا، اس طرح قرض کی ادائیگی ہوجائے گی۔

[ردالمحتار علی الدر المختار: ج۶/ص۴۴۳]

سوال: ایک شخص کے دادا نے قرض لیا تھا لیکن ادائیگی سے پہلے ان کی وفات ہوئی اور انہوں نے کسی وارث کو قرض ادا کرنے کی وصیت نہیں کی، اب ان کے ورثاء ان کی جانب سے قرض ادا کرنا چاہتے ہیں، تو کیا قرض کی ادائیگی ہوجائے گی؟

جواب: اگر کسی نے قرض لیا ہو اور قرض ادا کرنے سے پہلے اس کی وفات ہوجائے تو اس کے ترکہ سے قرض کی ادائیگی کی جائے اور اگر میت نے قرض کی ادائیگی کی وصیت نہیں کی اور ورثاء ادا کردیں تو یہ بھی کافی ہوجائے گا۔

[درمختار: ج۲/ص۵۳۳]

سوال: قرض کی ادائیگی کے وقت قرض سے زیادہ دینا جائز ہے یا نہیں؟ جب کہ زیادتی عقد میں مشروط نہ ہو بلکہ اتفاقاً قرض ادا کرتے وقت کچھ زیادہ دیدیا جائے؟

جواب: قرض ادا کرتے وقت کچھ زیادہ دیدیا جائے جبکہ زیادتی عقد میں مشروط ہو اور نہ اس کا رواج ہو کہ زیادتی کی امید کی جاتی ہو، تو ایسی صورت میں قرض سے زیادہ دینا درست ہے۔

[جامع ترمذی: ج۱/ص۲۴۰]

سوال: آج کل لوگوں میں بلاضرورت قرض لینے کا کافی رواج ہوگیا ہے، کیا بغیر مجبوری بھی قرض لینا جائز ہے؟

جواب: احادیث نبویؐ سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ مقروض بننا کوئی پسندیدہ عمل نہیں ہے اور جب تک کوئی واقعی حاجت درپیش نہ ہو حتی الامکان اس سے بچنا چاہیے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مقروض بننے سے اللہ کی پناہ مانگا کرتے تھے۔

[صحیح بخاری: ۲۳۹۷]

سوال: قرض لینے کے بعد اسکی ادائیگی کی فکر نہ کرنا یا ادا کرنے کی پوزیشن ہو اس کے باوجود ٹال مٹول سے کام لینا شرعاً کیسا ہے؟

جواب: ضرورت کے وقت ادائیگی کی نیت سے قرض لینا جائز ہے، لیکن قرض لے کر اس سے غافل ہوجانا اور ادائیگی کی نیت نہ کرنا جائز نہیں، حدیث نبویؐ میں ہے کہ غفلت کے تین درجے ہیں: ان میں سے ایک درجہ یہ ہے کہ آدمی قرض کی ادائیگی سے اس طرح غافل ہوجائے کہ وہ اس پر سوار ہوتا چلا جائے، اور اس کا خوف اس پر مسلط ہوجائے۔

[شرح مشکل الآثار للطحاوی: ۴۲۸۵]

دوسری حدیث میں ہے کہ: مالدار شخص کا قرض کی ادائیگی میں ٹال مٹول کرنا ظلم ہے۔ [ترمذی]

☆☆☆☆☆

ندوۃ العلماء
پوسٹ باکس ۹۳، ٹیگور مارگ، لکھنؤ
۲۲۶۰۰۷ یوپی (ہند)

NADWATUL-ULAMA
PO. BOX 93, TAGORE MARG, LUCKNOW
226007 U. P. (INDIA)

باسمہٖ تعالیٰ

تاریخ ۲۵ رمئی ۲۰۲۲ء

Date 25th May 2022

اہل خیر حضرات سے!

اللہ تعالیٰ کا شکر واحسان ہے کہ حضرت ناظم صاحب ندوۃ العلماء مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی دامت برکاتہم کی سرپرستی میں ندوۃ العلماء اپنی علمی ودینی تعلیمی وتربیتی خدمات انجام دے رہا ہے اور ان بیش قیمت اصولوں کو سینے سے لگائے ہوئے ہے جن کے لئے ندوۃ العلماء قائم کیا گیا تھا، یعنی جدید زمانے میں اسلام کی مؤثر اور صحیح ترجمانی، دین ودنیا کی جامعیت اور علم وروحانیت کے اجتماعیت کی کوشش، فتنہ لادینیت اور ذہنی ارتداد کا مقابلہ، اسلام پر اعتماد اور علوم اسلامیہ کی برتری وامتیاز کا اعلان واظہار، دین حق سے وفاداری اور شریعت پر استقامت۔

آپ سے ہماری درخواست ہے کہ وقت کی اس ضرورت اور دارالعلوم ندوۃ العلماء کی افادیت کو سمجھتے ہوئے پوری فراخدلی، فیاضی اور ہمت سے کام لے کر ان تمام کاموں میں بھرپور تعاون واعانت فرمائیں کہ ہندوستان میں دین کے قلعوں کی حفاظت کی اس سے بہتر کوئی سبیل اور اس سے زیادہ پائدار کوئی صدقہ جاریہ نہیں۔

جیسا کہ آپ کو معلوم ہے کہ رمضان المبارک کے موقع پر دارالعلوم ندوۃ العلماء کے اساتذہ، سفراو محصلین آپ حضرات کی خدمت میں حاضر ہوکر صدقات وعطیات کی وصولیابی کا کام انجام دیتے ہیں، لیکن اس وقت پورے ملک میں کورونا وائرس کی وجہ سے لاک ڈاؤن ہے، ایسے حالات میں سفر کرنا دشوار ہے۔ اس لئے آپ کے عطیات کی فراہمی بینک کے ذریعہ ہی بہتر ہے۔

لہٰذا آپ حضرات سے گذارش ہے کہ اپنے صدقات وعطیات چیک یا ڈرافٹ کے ذریعہ اور آن لائن ندوۃ العلماء کے مندرجہ ذیل اکاؤنٹ میں منتقل فرمائیں، ایسے نازک اور مشکل حالات میں ندوۃ العلماء کے ساتھ آپ کا تعاون نہایت اہمیت رکھتا ہے، اللہ تعالیٰ ہم سب کی کاوشوں کو قبول فرمائے اور ان کو ہمارے لئے ذخیرۂ آخرت بنائے۔ آمین

(مولانا ڈاکٹر) تقی الدین ندوی	(ڈاکٹر) محمد اسلم صدیقی	(مولانا ڈاکٹر) سعید الرحمٰن اعظمی ندوی	(مولانا) سید بلال عبدالحئ حسنی ندوی
معتمد تعلیم ندوۃ العلماء	معتمد مال ندوۃ العلماء	مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء	ناظر عام ندوۃ العلماء

NADWATUL ULAMA
STATE BANK OF INDIA MAIN BRANCH, LUCKNOW
(IFSC CODE : SBIN0000125)

عطیات	A/c. No. 1086 3759 711
تعمیرات	A/c. No. 1086 3759 733
زکوٰۃ	A/c. No. 1086 3759 766

ONLINE DONATION LINK
https://www.nadwa.in/donation/

نوٹ: چیک/ڈرافٹ پر صرف یہ لکھیں:
NADWATUL ULAMA
اور اس پتہ پر ارسال کریں
NIZAMAT NADWATUL ULAMA
Nizamat Office, Nadwatul Ulama,
Tagore Marg, Lukcnow - 226007 (U.P.)
معطیان کرام! براہ کرم اپنے عطیات ارسال کرنے کے بعد مندرجہ ذیل نمبر
+91 - 7275265518
پر مطلع فرمانے زحمت کریں، اس سے دفتری کاروائی میں سہولت ہوگی۔
فجزاکم اللہ خیرا الجزاء

website : www.nadwa.in
Email : nizamat@nadwa.in

نوٹ: ندوۃ العلماء لکھنؤ کو دیا گیا تعاون سیکشن 80G انکم ٹیکس ایکٹ ۱۹۶۱ء کے تحت انکم ٹیکس سے مستثنیٰ ہوگا